خصوصی شمارہ

سیاست، جمہوریت، ووٹ اور اسلام

دینی | اصلاحی | فکری | علمی

ماہنامہ

شاہراہِ علم

جامعہ کا پیغام ملّتِ اسلامیہ کے نام

رجب المرجب ۱۴۳۵ھ - مئی ۲۰۱۴ء

زیرِ سرپرستی

حضرت مولانا غلام محمد صاحب وستانوی مدظلہ العالی

مدیر

حذیفہ مولانا غلام محمد صاحب وستانوی

ظالم حکمرانوں کے تسلط کے ظاہری وباطنی اسباب اور اسکا علاج

- اقسام سیاست
- اسلام کا نظریۂ سیاست
- حکومت کا اسلامی تصور
- مقاصد حکومت
- مغربی جمہوریت کی تعریف اور تعارف
- جمہوریت کا فلسفہ اور فکری بنیادیں
- ہندوستان کا نظام حکومت
- ووٹ کی شرعی حیثیت
- سیاست کا اسلام سے تعلق
- الیکشن سے متعلق مسائل

جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم، اکل کوا، نندوربار، مہاراشٹر ۴۲۵۴۱۵

وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا (طٰہٰ)

ماہنامہ

”شاہراہِ علم“

(جامعہ کا پیغام ملتِ اسلامیہ کے نام)

زیر سرپرستی

حضرت مولانا غلام محمد صاحب وستانوی مدظلہ العالی

مدیر: حذیفہ مولانا غلام محمد وستانوی

جلد نمبر: ۳ شمارہ نمبر: ۴

ماہ: رجب المرجب ۱۴۳۵ھ مئی ۲۰۱۴ء

ترسیل زر کا پتہ

”دفترِ شاہراہِ علم“

جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم، اکل کوا، ضلع نندوربار، مہاراشٹر، ۴۲۵۴۱۵

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نمبر شمار	فہرست	صفحہ
۱	اداریہ: سیاست، ریاست، حکومت، جمہوریت...............حذیفہ مولانا غلام محمد صاحب وستانوی	۴
۲	ملفوظات وستانوی..............................ازملفوظات وستانوی	۶
۳	معارف کاپودروی..............................ازصدائے دل	۷
۴	معارف باندوی..............................ازمجالس باندوی	۸
۵	معارف تھانوی..............................ازتحفۃ العلماء	۹
۶	اسلام کا سیاسی نظریہ..............................	۱۰
۷	سیاست کی اصطلاحی تعریف:..............................	۱۱
۸	اسلام کا نظریہ سیاست..............................	۱۵
۹	حکومت کا اسلامی تصور..............................	۱۷
۱۰	مقاصد حکومت..............................	۲۲
۱۱	مغربی جمہوریت کی تعریف اور تعارف..............................	۲۵
۱۲	جمہوریت کا فلسفہ اور فکری بنیادیں..............................	۲۹

نوٹ: ماہنامہ "شاہراہ علم" مدیر وایڈیٹر مولانا محمد حذیفہ غلام محمد وستانوی صاحب رندیرا" جامعہ کوارٹر جامعہ نگر اکل کوا
"

(...... کمپوزنگ وسیٹنگ: رفیق احمد اشاعتی کٹیہاری/ محمد سجان ارریاوی اشاعتی ......)

۱۳	ہندوستان کا نظامِ حکومت	۴۱
۱۴	سیاست کو اسلام سے الگ ماننا اور اس کا حکم	۵۳
۱۵	انتخابات میں ووٹ کی اسلامی حیثیت	۶۱
۱۶	ووٹ نہ دینا حرام ہے	۶۳
۱۷	نا اہل کو ووٹ دینا شدید تر گناہ ہے	۶۵
۱۸	کس سیاسی جماعت میں حصہ لیا جائے؟	۶۷
۱۹	فقہ وفتاویٰ...... الیکشن سے متعلق مسائل...... مفتی محمد جعفر صاحب ملی رحمانی صدر دارالافتاء جامعہ اکل کوا	۷۳

ضروری ہدایت

ماہنامہ ''**شاہراہِ علم**'' مہینہ شروع ہونے سے پانچ روز قبل گزشتہ مہینہ کی ۲۵ ر تاریخ کو ہی روانہ کر دیا جاتا ہے، تاکہ پہلے عشرے تک موصول ہو سکے۔ لہٰذا ۱۰ ر تاریخ تک موصول نہ ہونے کی صورت میں اپنے مقامی ڈاک خانہ میں تحقیق وکارروائی کریں، اور دو تین روز مزید انتظار کے بعد بھی دستیاب نہ ہو، تو دفتر شاہراہِ علم کے نمبر پر اپنا خریداری نمبر بتا کر رابطہ کریں۔ ان شاء اللہ آپ کی شکایت دور کی جائے گی اور دوبارہ رسالہ روانہ کیا جائیگا۔

نوٹ: جن خریدار کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے اور وہ رسالہ جاری رکھنے کے لیے منی آرڈر روانہ کرتے ہیں تو اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں۔ اور نئے ممبران مکمل پتا اور جدید خریدار لکھنا نہ بھولیں۔

ترسیل زر کے لیے ذیل میں دیے گئے پتے پر E.MO یا اس کی سہولت نہ ہونے کی صورت میں سادہ منی آرڈر کریں اور بذریعہ فون منی آرڈر کرتے ہی اطلاع کریں۔

رابطہ اور ترسیلِ زر کے لیے
Office: Shahrah-e-Ilm
Jamia Islamia Isha'atul Uloom Akkalkuwa Nandurbar (M.S.) Pin. 425415

Email: shahraheilmmagazine@gmail.com
PH: 02567-252256-252356 Mb. 9011958392

اداریہ:

حذیفہ مولانا غلام محمد صاحب وستانوی

ظالم حکمرانوں کے تسلط کے ظاہری وروحانی اسباب اور اس سے نجات کا راستہ

یعنی

سیاست، ریاست، حکومت، جمہوریت اور ووٹ کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر مع اسباب تدارک

الحمد للہ ہم مسلمان ہیں اور مسلمان کا اولین فرض یہ بنتا ہے کہ وہ کسی انفرادی یا اجتماعی موڑ پر ہو یا کسی چھوٹے بڑے کام کو انجام دینے جارہا ہو، سب سے پہلے اس کے بارے میں شرعی حکم معلوم کرے کہ، اس کام کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیونکہ انسان کو اللہ نے اسی لیے پیدا کیا ہے کہ، وہ اپنے اختیار سے اللہ کی مرضیات پر چلنے کی حتی المقدور کوشش کرے، تاکہ خوشنودیٔ جل وعلا حاصل ہو اور یوں انسان اپنے مقصدِ حیات یعنی ''رضاء الٰہی'' کو حاصل کرلے اور رضاء الٰہی کے حصول کا ذریعہ ''اطاعت نبوی ہے'' اور اطاعت نبوی کو معلوم کیا جاتا ہے ''احکام شرعیہ'' سے، لہٰذا احکام شرعیہ سے واقفیت ازحد ضروری ہے، جس سے امت آج یکسر غافل ہے۔

ہندوستان میں پانچ سال بعد اب ۲۰۱۴ء میں اگلے پانچ سال کے لیے ''انتخاب'' کی تاریخوں کا بگل بج چکا ہے اور نئے انتخابات کی آمد آمد ہے۔ حزب اقتدار، اور حزب اختلاف ہی نہیں، بلکہ دیگر نئے پرانے احزاب بھی انتخابی سرگرمیوں کو شباب پر لیجا چکے ہیں اور اب عوامی نگاہیں الیکشن میں ۵۴۵ سیٹوں کے ۱۶ مئی کو ہونے والے نتائج کے اعلان پر جمی ہوئی ہیں۔ ۷/ اپریل سے انتخابات شروع ہوں گے اور ۱۲ مئی کو ختم ہوں گے، دنیا کے اس سب سے بڑے الیکشن میں ساڑھے اکیاسی کروڑ ووٹر اپنا حقِ رائے دہی استعمال کریں گے اور الیکشن کمیشن کا اس پر تقریباً تین ہزار پانچ سو کروڑ روپے خرچ آئے گا اور سیاسی پارٹیاں کم ازکم تیس ہزار پانچ کروڑ روپے یعنی پانچ ملین ڈالر خرچ کرے گی، اس اعتبار سے امریکہ کے بعد یہ دوسرا سب سے بڑا ہنگامی الیکشن ہوگا۔

انتخابات جو جمہوری طرۂ امتیاز ہے، وہ کسی بھی ملک کی زندگی میں انقلابی موڑ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور یہ موڑ کس قدر نازک اور خطرناک ہوسکتا ہے؟ اس کا اندازہ اس قوم کو اچھی طرح ہونا چاہیے، جو

آزادی کے بعد سے لیکر اب تک صحیح معنی میں ترقی نہیں کر سکی !!!!!

حکومت پر تنقید ہر مہذب ملک میں عوام کا ناگزیر حق سمجھا جاتا ہے، اور اس حق کی ضرورت و اہمیت ناقابل انکار ہے، لیکن ہمیں اس بات کا اعتراف پوری کشادہ دلی سے کرنا چاہیے کہ، ہم نے ماضی میں اس حق کے استعمال کے بہانے خود اپنی بہت سی کمزوریوں کو چھپانے کی بھی کوشش کی ہے، اور اس پہلو سے بہت کم غور کیا ہے کہ ہمارے حکام در حقیقت خود ہمارے اپنے کردار و عمل کا آئینہ ہوتے ہیں۔ وہ لوگ بلا شبہ قابل صد نفرین و ملامت ہیں، جو اپنی دولت کے سہارے ووٹ خرید خرید کر اقتدار تک پہنچتے ہیں؛ لیکن ان کے جرم میں وہ عوام بھی برابر کے شریک ہیں جو کھنکتے ہوئے سکوں کی آواز سن کر قوم و ملک اور دین و اخلاق سب کو بھول جاتے ہیں، اور پھر جب ان کے ووٹوں کے خریدار اقتدار کی کرسی پر بیٹھ کر سارے عوام کا خون نچوڑتے ہیں، تو یہ اپنے گریبان میں منہ ڈالنے کے بجائے حکومت پر تنقید کے بہانے دولت کے کسی نئے سورج کی پرستش شروع کر دیتے ہیں۔

موجودہ پارلیمانی طرز حکومت میں جو حکومت بھی برسر اقتدار آتی ہے، وہ انتخابات ہی کے ذریعے اقتدار کے منصب تک پہنچتی ہے، لہذا اس حکومت کے تمام اعمال و افعال اس کے منتخب کرنے والے عوام کی طرف منسوب ہوتے ہیں، اور ان کی دنیوی اور اخروی ذمہ داری بڑی حد تک ان لوگوں پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے اپنے ووٹ دے کر اسے منتخب کیا۔ لہذا یہ انتخابات جو منعقد ہونے والے ہیں، کوئی کھیل تماشا نہیں ہے، جسے بے پرواہی سے دیکھ کر گزار دیا جائے، بلکہ یہ انتہائی ذمہ داری کا معاملہ ہے، اور ملک کے ہر باشندے کا فرض ہے کہ وہ اسے پوری سوجھ بوجھ اور دیانت داری کے ساتھ طے کرے۔

اگرچہ عملی سیاست سے ہمارا کبھی کوئی تعلق نہیں رہا، لیکن اسلام نے زندگی کے ہر شعبے کی طرح اس شعبے میں بھی ہمیں کچھ اصولی ہدایات عطا کی ہیں، اور سر دست انہی ہدایات کی تھوڑی سی تشریح مقصود ہے۔

شرعی اعتبار سے ''ووٹ'' ایک شہادت ہے۔ آپ جس شخص کو اپنا ووٹ دیتے ہیں گویا اس کے بارے میں یہ گواہی دیتے ہیں کہ یہ شخص آپ کی نظر میں اسمبلی کی رکنیت یا حکومت کا اہل ہے، اور آپ کے حلقہ انتخاب میں آپ کے نزدیک اس منصب کے لیے اس شخص سے زیادہ کوئی موزوں نہیں ہے۔ لہذا ''ووٹ'' پر شرعی اعتبار سے وہ تمام احکام جاری ہوتے ہیں جو شہادت پر جاری ہیں۔

الغرض ووٹ، الیکشن، سیاست، حکومت یہ دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہیں، کسی نہ کسی درجہ میں ان کا اسلام سے تعلق ہے اور اسی تعلق کی بنا پر ان کے متعلقہ احکام اور اسلامی نقطۂ نظر کا جاننا اہم اور ضروری ہے۔ اسی اہمیت و ضرورت کے پیشِ نظر اس شمارے میں سیاست، ریاست، حکومت، جمہوریت اور ووٹ کے متعلق مواد کو شریعت اسلامیہ کی

روشنی میں جمع کر دیا گیا ہے۔ جس کے مطالعہ کے بعد صحیح صورت اور حقیقت واضح ہو جائے گی، اور ہمارے لیے اس کشمکش سے چھٹکارہ پانا آسان ہو جائے گا کہ ہمیں ووٹ دینا چاہیے یا نہیں؟ اور دینا چاہیے تو کسے دینا چاہیے؟ نیز سیاستِ اسلامی اور مغربی جمہوریت کے درمیان امتیاز اور ان دونوں کے مقاصد بھی آشکارہ ہو جائیں گے۔ بقیہ صفحہ ۱۰

ملفوظاتِ وستانوی

حضرت مولانا وستانوی مدظلہ العالی کے ملفوظات وارشادات

ملفوظ (۵۹): آپ نے اس دعاء کو ''اللھم

ملفوظ (۶۰): آپ جس ملک میں رہتے ہیں، اکثریت کے ساتھ مل جل کر رہیں، آج علماء پر حکومت و گورنمنٹ کی نگاہ ہے، اس لئے آپ اپنے بیان میں کوئی ایسی بات نہ کہیں جس سے آپ پر کوئی مصیبت آئے سنبھل کر بات کریں، چاہے سفر میں ہوں یا حضر میں، کس طرح بات کرنی ہے پہلے سوچ لینی چاہیے، کبھی آپ کو نوجوان ابھاریں گے کہ شعلہ انگیز بیان کرو، نہیں کرنا چاہیے بلکہ یوں کہہ دینا چاہئے کہ میرے ذہن میں جو بات آئیگی بیان کروں گا، آپ نے فرمایا بہت بھولے نہ بن جانا، کسی کی ہمدردی میں بھی آکر بیان نہ کرنا، ہوسکتا ہے کوئی تمہارے کندھے پر بندوق رکھ کر چلانا چاھتا ہو، کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو اپنے اساتذہ اور اپنے علاقے کے بزرگوں سے رجوع کر لینا چاہئے۔

......*

معارف کاپودروی

باطل قوتیں اسلام کے خلاف متحد

اسلام کے خلاف دنیا میں جو سازشیں چل رہی ہیں وہ بہت خطرناک طریقہ سے اٹھ رہی ہیں، ہر دور میں ایسا ہوتا آیا ہے کہ اسلام کے خلاف کچھ قوتیں کام کرتی رہی ہیں لیکن اس وقت یہ کوششیں اور تیز تر ہوتی جارہی ہیں اور ان کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا ہے، ہمارے مکاتب، مدارس اور ہمارے علماء کو یہ لوگ ایک آنکھ دیکھنا

پسند نہیں کرتے۔

بقول مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ یہ تاریخ کا سب سے بڑا المیہ ہے کہ اس دور میں نصرانی طاقتیں یہودیوں کے ساتھ مل گئی ہیں، حالانکہ نصرانی شروع سے یہودیوں کے دشمن رہے ہیں، کیونکہ عیسائی لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو (ان کے زعم میں) یہودیوں نے ہی سولی دی ہے، تو جنہوں نے ان کے پیغمبر کو سولی پر چڑھایا ہو ان کے ساتھ دوستی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس لیے حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ فرماتے تھے کہ یہ عجیب بات ہے کہ اس زمانہ میں اسلام کے خلاف یہود و نصاریٰ متفق ہو چکے ہیں، انہوں نے اپنے اتحاد کے خاطر اپنے عقائد میں تبدیلی کر لی ہے اور انہوں نے آپس میں مل کر ایسے حالات پیدا کر دیے ہیں کہ اسلام کسی بھی صورت میں دنیا کے کسی خطے اور علاقے میں نہ ابھرے۔

اور پھر ان کی کوششیں ان ممالک تک پہنچ چکی ہیں جن کا تعلق ان مذاہب کے ساتھ نہیں ہے جو یہودیت اور نصرانیت کے قائل نہیں ہیں جیسے ہندومت یعنی دیومالائی تہذیب (سنسکرتی) کے ماننے والے ممالک حالانکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ مشرک ہیں اور ہمارے ساتھ ان کا کوئی جوڑ نہیں ہے لیکن صرف اسلام کی عداوت کی وجہ سے انہوں نے ان کے ساتھ جوڑ پیدا کیا ہے، بہر حال اس وقت حالات بڑے عجیب ہیں۔

اور پوری دنیا میں کوئی خطہ باقی نہیں جہاں انہوں نے بہت تیزی کے ساتھ سازشوں کا جال نہ پھیلایا ہو، ایسے حالات میں ہم لوگوں کی جن کا تعلق مدارس سے ہے جو اہل علم اور اور اساتذہ کہلاتے ہیں جو قرآن و حدیث پڑھنے پڑھانے والے ہیں ان کی ذمہ داری پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہے، اور اللہ کا فضل ہے میرے دوستو! کہ اس امت کی قیادت اور رہنمائی جب بھی کی ہے ان بوریا نشینوں نے کی ہے، پوری تاریخ ہم کو بتلاتی ہے کہ اس امت کی کشتی جب بھی ڈانواڈول ہوئی تو علماء ہی نے اس امت کو سنبھالا، ہر زمانہ کے علماء نے اپنے زمانہ کے فتنوں کو سمجھا اور ان کی سرکوبی کے لیے ترتیب و اتحاد کے ساتھ کمر بستہ ہوئے۔

معارف باندوی رحمۃ اللہ علیہ

طلباء کے اوصاف

طالب علم کو تو اس پر قناعت ہونا چاہیے کہ اس کو پیٹ بھر کر دو روٹی نصیب ہو جائیں جس سے اس کمر

سیدھی ہو سکے، سامان رکھنے کی جگہ مل جائے، پڑھنے کے لیے روشنی کا انتظام ہو جائے بس، یہاں مدرسہ کی طرف سے روشنی کا انتظام کیا جاتا ہے، جرنیٹر چلتا ہے لیکن اگر نہ بھی ہو یا کچھ دیر ہو جائے تو طالب علم کو چاہیے کہ اپنی طرف سے خود اس کا انتظار رکھے، ہر کمرہ میں ایک لالٹین ہونا چاہیے جہاں جرنیٹر چلنے میں دیر ہو لالٹین جلا کر کتاب دیکھنا شروع کر دیں۔

دو باتوں کا اہتمام زیادہ کریں ایک تو نماز کا اہتمام دوسرے درجہ کی پابندی اس میں ناغہ نہ ہونا چاہیے، حاضری دو یا نہ ہو، کوئی نگرانی کرنے والا ہو یا نہ ہو ہمارا کام ہے ہم کو کرنا ہے۔

صفائی کا اہتمام

ان سب کے ساتھ ساتھ صفائی کا بھی بہت اہتمام رکھو، کمرہ اور کمرہ کے سامنے کا صحن بالکل صاف ہونا چاہیے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "نظفوا افنیتکم" اپنے گھر کے سامنے کے صحنوں کو صاف رکھو جب صحن کی صفائی کا حکم ہے تو خود مکان کی صفائی کا حکم کس درجہ ہوگا، مدرسہ میں اگر صفائی نہ ہوگی تو کہاں ہوگی، اور مدرسہ والے اس کا اہتمام نہ کریں گے تو کون کرے گا، ایسا نہ ہو کہ ہر کمرہ کے سامنے کوڑے کا ڈھیر لگا ہوا ہو، کمرہ میں رہنے والے لڑکے باری مقرر کرلیں اور باری باری صفائی کرتے رہا کریں۔

☆......☆......☆

معارف تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

کیا مزاح سے رعب وخوف کم ہو جاتا ہے:

اور اگر کوئی یوں کہے کہ مزاح سے خوف زائل ہو جاتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ یہ وہاں ہوتا ہے جہاں مزاح کرنے میں شان رعب کم ہو اور وہ مزاح بکثرت کرے اور اگر شان رعب بہت زیادہ ہو جیسا کہ حضور صلی

اللہ علیہ وسلم کی بابت احادیث میں وارد ہے اور مزاح بھی کثرت سے نہ ہوتو اس صورت میں مخاطب بے خوف نہیں ہوسکتا۔ چناں چہ مشاہدہ اس کی دلیل ہے اور احادیث سے معلوم ہوسکتا ہے کہ حضرات صحابہ کے قلوب میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کس درجہ تھی اور جب کبھی آپ کو کسی بات پر غصہ آگیا تو صحابہ کی کیا حالت ہوتی تھی کہ حضرت عمرؓ جیسے قوی القلب بھی تھرا جاتے تھے۔ (التبلیغ الحدود والقیود ص ۱۶۳ ج ۱۵)

کیا مزاح کرنا وقار کے خلاف ہے:

(۱) یہ مسلم نہیں کہ ہر مزاح خلاف وقار ہے خلاف وقار صرف وہ مزاح ہے جس میں کوئی مصلحت وحکمت نہ ہو۔ (انفاس عیسیٰ ص ۳۸۹ ج ۱)

(۲) خلاف وقار صرف وہ مزاح ہے جس میں کوئی مصلحت نہ ہو اگر مزاح سے مقصود اپنا یا مخاطب کا انشراح قلب اور انقباض (یا دوری) کا ختم کرنا ہو تو وہ عین مصلحت ہے مزاح سے خوف وہاں زائل ہوتا ہے جہاں مزاح کرنے والے میں شان رعب کم ہو اور وہ مزاح بکثرت کرے۔ (التبلیغ ص ۱۶۳ ج ۱۵)

کبھی کبھی اور اعتدال کے ساتھ مزاح کرنے کا اثر اور اس کا فائدہ:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاح سے آپ کے وقار وعظمت میں کمی نہ آتی تھی بلکہ اس کا اثر صرف یہ تھا کہ صحابہ کے قلوب میں انشراح پیدا ہوتا۔ اور وہ انقباض (اور بعد) جاتا رہتا تھا جو غایت رعب کی وجہ سے قلوب میں عادۃً پیدا ہوتا ہے جس کا ثمرہ یہ تھا کہ قلوب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت جاگزیں ہوتی تھی۔ اگر آپ مزاح نہ فرماتے تو صحابہ کے اوپر آپ کا خوف ہی غالب ہوتا۔ محبت غالب نہ ہوتی اور جب مزاح سے آپ کی محبت غالب ہوگئی تو آپ کے وقار وعظمت کا منشا صرف خوف تھا اب محبت وخوف دونوں مل کر کام کرنے لگے۔ (التبلیغ الحدود والقیود ص ۱۶۲ ج ۱۵)

☆……☆……☆

(مابقیہ صفحہ ۵ ……)

اسلام کا سیاسی نظریہ:

علم سیاست: سیاست درحقیقت عربی زبان کا لفظ ہے، یہ ماخوذ اور مشتق ہے السائس سے اور سائس کہتے ہیں، اس شخص کو جو جانوروں کو پالے پوسے اور اس کی عمدہ دیکھ بھال اور پرورش کرے۔

دوسرا معنی کسی چیز کو اچھی حالت پر برقرار رکھنے کے لیے کوشاں ہونا، فکر مند ہونا۔

ساس الوالی کہا جاتا ہے کسی کا اپنی رعایا کو کسی چیز کا مکلف کرنا اور ان کی ذمہ داری اپنے سر لینا گویا "السیاسۃ" کل تین معانی کو مستلزم ہے "تدبیر، اصلاح، تربیت"۔

{الصحاح، القاموس المحیط، التاج، اللسان، المصباح، المغرب، اساس البلاغۃ، النہایۃ، معجم الوسیط بحوالہ الموسوعۃ الفقہیۃ وزارۃ الاوقاف کویت ج ۲۵ ص ۲۹۴}

فارسی اور اردو لغات میں معنی سیاست

غیاث اللغات میں علامہ غیاث الدینؒ سیاست کے بارے میں فرماتے ہیں کہ:

سیاست پاس داشتن ملک، وحکم راندن، وقہر کردن، وہیبت نمودن، وضبط ساختن مردو از خلق بترسانیدن وزدن۔ (غیاث اللغات: ص ۳۶۳)

ملک کی حفاظت کرنا، لوگوں پر حکم کرنا، لوگوں پر رعب ڈالنا، لوگوں کو کنٹرول کرنا، لوگوں کو ظلم سے بچانا ظالم کے مارنے اور ڈرانے سے۔

فرہنگ عمید میں علامہ ابوالحسن عمیدؒ فرماتے ہیں:

اداره کردن امور مملکت، مراقبت امور داخلی وخارجی کشور، اصلاح امور خلق، رعیت داری، مردم داری۔ (حسن عمید فرہنگ عمید: ص ۷۶۸)

مملکت کے کاموں کو ادارہ کرنا، ملک کے داخلی وخارجہ امور کا خیال رکھنا لوگوں کے کام اور ان کا لحاظ رکھنا۔

مولانا عبدالحی لکھنویؒ متوفی (۱۳۰۴ھ) فرماتے ہیں: لفظ سیاست "ساس الوالی الرعیۃ أمرھم ونھاھم"۔ کا مصدر ہے۔ یعنی اپنی رعایا کو حکم کرنا اور ان کو روکنا۔ (عبدالحی لکھنوی۔ حاشیہ شرح الوقایہ: ۲/ ۲۸۲)

علامہ وحیدالزمان کیرانویؒ (متوفی ۱۹۹۵م) رقم طراز ہیں:

سیاست (۱) ملکی معاملات کا تدبیر وانتظام (۲) معاملات کی نگہداشت (۳) حکمت عملی، تدبیر (۴) پالیسی، ڈپلومیسی (۵) اصول جہان بانی، اصول حکمرانی (القاموس الوحید: ص ۸۲۲) (اسلام کا نظام سیاست وحکومت ج ۱ ص ۱۲۴ تا ۱۲۵)

سیاست کی اصطلاحی تعریف:

امام غزالیؒ نے سیاست کی تعریف کی ہے: استصلاح الخلق وارشادھم الی الطریق المستقیم المنجی فی الدنیا والآخرۃ۔ سیاست کہتے ہیں مخلوقِ خدا کی درستگی کو طلب کرنا۔ اور اسے ایسا سیدھا راستہ بتلانا، جو دنیا وآخرت کے لیے باعث نجات ہو۔ (احیاء العلوم ۱/ ۱۳)

امام ابن خلدون نے سیاست کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے: السیاسۃ ھی کفالۃ الخلق وخلافۃ اللہ فی العباد لتنفیذ احکامہ فیھم۔ سیاست نام ہے لوگوں (یعنی ملک کے باشندوں) کی کفالت کرنا، اور اللہ کے بندوں میں اس کی خدمت کو قائم کرنا؛ تاکہ اس خدمت کے ذریعہ اس کے احکام اس کے بندوں میں نافذ کیے جائیں۔ (مقدمہ ابن خلدون: ۱/ ۱۱۳)

علامہ شمس الحق افغانی نے مختصر اور جامع تعریف کی ہے: ھو النظام المحافظ لحقوق الالھیۃ

و البشریۃ ۔

حقوق اللہ اور حقوق العباد کا محافظ نظام ِ سیاست کہلاتا ہے ۔(دروس الفاتحہ من افادات شمس الحق:ص ۲۴۴)

یہ تعریف مختصر اور جامع ہے کہ سیاست اور حکومت نام ہے، حقوق اللہ اور حقوق العباد کو تحفظ بخشنے والے نظام کا، اگر آج ہم اس تعریف کے رو سے ہمارے حکام پر نظر کریں، تو اندازہ ہوجائے گا کہ فلسفۂ مغرب یا فتنۂ یورپ نے سیاست کو دین ہی سے جدا کردیا، لہٰذا حقوق اللہ کی حفاظت کا کوئی سوال ہی نہیں رہا؟ اور جب حقوق اللہ نہیں تو خوفِ خدا نہیں !۔ اور جب خوفِ خدا و فکرِ آخرت نہیں، تو حقوق العباد کا بھی دور دور تک کوئی اتا پتا نہیں! اور تو اور مسلمانوں میں بھی ایسے نام نہاد دانشوروں کا ٹولہ کھڑا ہوگیا ہے، جو اسلام اور حکومت و سیاست کی تفریق کا قائل ہے کہ اسلام صرف عبادت پر ہی منحصر ہے معاشرت و معیشت میں اسلام کو کوئی دخل نہیں لا حول و لا قوۃ الا باللہ۔ إنا للہ و انا الیہ راجعون ۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے!!! اسلام تو کامل و مکمل دین ہے اور خدائی دستورِ حیات ہے، وہ کیسے انسان کی زندگی کے کسی بھی شعبے سے جدا ہوسکتا ہے؟ انسان کی اجتماعی و انفرادی، ظاہری و باطنی شعبہائے زندگی میں کوئی بھی شعبہ ایسا نہیں جہاں اسلام انسان کی رہنمائی کرنے سے عاجز ہو، ہر زمانہ میں اور ہر جگہ اسلام نے ہمیشہ انسان کی سو فیصد صحیح رہنمائی کی ہے، کیونکہ اسلام کسی انسان کا اختراع کردہ دین نہیں ہے، بلکہ وہ تو خالق کون و مکان کا تجویز کردہ اور نازل کیا ہوا دین ہے، اگر اس پر حرف آتا ہے، تو گویا اللہ کی ذات پر حرف آنا صادق آتا ہے، جبکہ اللہ کی ذات ہر طرح کے نقص و عیب کے شائبہ سے بھی پاک اور منزہ ہے۔

اقسامِ سیاست

اصول و ہنر میں سیاست بہتر ہے، پھر سیاست کی چار قسمیں ہیں۔

اول: انبیاء کرام علیہم السلام کی سیاست اور ان کا حکم خواص اور عوام دونوں کے ظاہر اور باطن پر ہے یعنی ان کے ظاہری جسموں اور باطنی دلوں پر ہے۔

قسم دوم: حاکموں کی سیاست ہے اور اس کا حکم خواص و عوام دونوں کے ظاہری جسموں پر ہے نہ کہ باطنی دلوں پر لیکن اس صورت میں کہ حاکم متقی ہو۔

تیسری قسم: حکماء کی سیاست ہے، لیکن اس کا حکم خاص لوگوں کے دلوں پر ہوتا ہے۔

چوتھی قسم: واعظوں اور فقہائے کرام کی سیاست ہے اور اس کا حکم عام لوگوں کے دلوں پر ہوتا ہے، اور انبیاء علیہم السلام کی سیاست کے بعد بہتر سیاست افادہ علم اور علم سے لوگوں کی اصلاح ہے ۔(اسلام کا نظام سیاست وحکومت: ص ۱۵۰)

تاریخِ سیاست:

سیاست کوئی نیا علم یا نیا طریقہ نہیں ہے، بلکہ اس کی تاریخ کافی قدیم ہے، اس کا وجود ظاہری تو بعد نوح اور قبل عہدِ ابراہیم ہی ہونا چاہیے، کیونکہ فرعون ملک مصر اور نمرود ملک بابل دونوں کا تذکرہ حضرت ابراہیم علیہ

السلام کی سیرت میں ملتا ہے، البتہ ایک مستقل علم کی حیثیت سے اس پر جولٹریچر ملتا ہے، وہ قبل المسیح ۴۰۰ سے ملتا ہے اور فلسفۂ یونان کی دو شاخیں ذکر کی جاتی ہیں۔

(۱)حکمتِ نظریہ (۲)حکمتِ عملیہ

پھر حکمتِ عملیہ کی تین شاخیں ہیں

(۱) سیاستِ مدن (۲) تدبیر منزل (۳) تہذیب الاخلاق

گویا جب سے فلسفہ کا وجود ہے تب ہی سے سیاست مدن سے بھی بحث ہو رہی ہے، سیاست مدن پر سب سے پہلی کتاب افلاطون کی ہے "جمہوریہ" کے نام سے، جس کا انگریزی ترجمہ "Republic" نام سے شائع شدہ ہے، اس کے بعد اس کے شاگرد ارسطو کی کتاب "سیاست" ہے، جو انگریزی میں "Politics" کے نام سے شائع ہو رہی ہے۔

ریاست کی تاریخ:

سیاست کا تعلق ریاست سے ہے، لہٰذا سیاست کا جاننا اور اس کی تاریخ ریاست کی تاریخ جاننے پر موقوف ہے، لہٰذا ریاست کی تاریخ پر اچٹتی نظر ضروری ہے۔

ریاست کیسے وجود میں آئی ؟ اس سلسلے میں بنیادی طور پر دو نظریے ہیں:

(۱) مادی نظریہ (۲) روحانی یا توفیقی نظریہ

پھر مادی نظریات میں سے مشہور یہ ہیں

(۱) معاہدہ عمرانی Social contract

(۲) نظریہ قوت

(۳) نظریہ پدرسری یا مادرسری Patriarchal or matriarchal

(۱) اصل خداوندی کا نظریہ Theory of divine origin یعنی اللہ نے آدمؑ کو پیدا کیا اور آدمؑ نے اپنی ذریت کی تربیت کی، وہ روحانی و جسمانی ہر دو اعتبار سے اپنی اولاد کے پیشوا تھے، نبی بھی تھے اور حاکم و بادشاہ بھی، متبوع بھی تھے اور والد بھی، ان کی ذریت تابع تھی اولاد تھی اور امت بھی تھی، تینوں مادی نظریات محض اندازے اور اٹکل کے سوا کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

معاہدۂ عمرانی:

انسان خود بخود وجود میں آیا اور وہ دنیا میں بغیر ریاست وحکومت کے تھا، پھر آپس کے مفادات کی وجہ سے ٹکراؤ شروع ہوا، لہذا اس ٹکراؤ کو دور کرنے کے لیے آپس میں معاہدہ ہوا اور ایک کو حاکم بنایا اور اس طرح ریاست وجود میں آئی، مگر یہ سب کب ہوا؟ اس پر نہ کوئی دلیل، نہ کوئی شاہد، نہ کوئی ثبوت ان کے پاس ہے۔

نظریہ قوت:

لوگ ابتدا میں جب وجود میں آئے، تو انفرادی زندگی گزارتے تھے، پھر آپس میں لڑنے لگے جو غالب آتا وہ حاکم بنتا، اس طرح ریاست وجود میں آئی۔

یہ بھی بے سند بے دلیل اور غیر معقول نظریہ ہے۔

نظریہ پدرسری یا مادرسری:

ریاست خاندان سے چلتی ہے، ہر خاندان کا ایک سربراہ ہوتا ہے، پھر کئی خاندان مل کر قبیلہ بنتا ہے، اور اس میں ایک کو حاکم متعین کر لیتے ہیں، پھر کئی قبیلہ مل کر ایک ریاست بنتی ہے، اس پر ایک حاکم ہوتا ہے۔ یہ بھی بے تکا نظریہ ہے۔ میری سمجھ سے یہ بات بالاتر ہے کہ اپنی ہوشیاری اور عقلمندی پر ناز کرنے والے ان نادانوں کے گلے یہ سب بے بنیاد خرافات کیسے اترتی ہے؟ ان کو اللہ کی خالقیت اور ربوبیت اور اس کی شریعت جو بدیہی ہے، وہ سمجھ میں نہیں آتی اور یہ نظریۂ معقول کیسے سمجھ میں آتی ہے؟ یاللعجب اللہ ہماری ہر طرح کی گمراہی سے حفاظت فرمائے، یہ ہوا ریاست کا بیان۔

جیسا کہ ماقبل میں گزرا کہ سیاست پر مستقل علم وفن کا آغاز افلاطون سے ہوا، پھر ارسطو نے قلم اٹھایا مگر یہ سب دہریہ قسم کے لوگ تھے، البتہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام چونکہ ولایتِ ظاہریہ وباطنیہ دونوں کے حامل ہوتے تھے، لہذا ان پر جو وحی نازل ہوتی تھی، اس میں سیاست وریاست کے احکام بھی ہوتے تھے اور بعض انبیاء مثلاً حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام، کو تو باقاعدہ جہاں بانی کے احکام بھی صراحت کے ساتھ وحی کے ذریعہ بتلائے جاتے تھے، جیسا کہ یاداود انا جعلناک خلیفة وغیرہ آیات سے ثابت ہوتا ہے۔

نزول قرآن کے بعد جیسے علوم کا چشمہ پھوٹ پڑا اور بے شمار علوم پر لاتعداد کتابیں تحریر کی گئیں۔ تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، اسماء رجال، تاریخ نحو صرف، بیان بلاغت، منطق وہیں سیاست پر بھی علماء اسلام نے

کتابوں کا ڈھیر لگا دیا جس میں سے مشہور یہ ہیں۔

(۱) الاحکام السلطانیہ	امام ماوردی	متوفی ۴۵۰ھ
(۲) الاحکام السلطانیہ	قاضی ابویعلی	۴۵۸ھ
(۳) الامامۃ والسیاسۃ	ابن قتیبہ الدینوری	۲۷۶ھ
(۴) آداب الملوک	ابو منصور ثعالبی	۴۲۹ھ
(۵) آراء اہل المدینۃ الفاضلۃ	فارابی	۳۳۹ھ
(۶) اساس السیاسۃ	علی الازدی	۶۲۳ھ
(۷) اساس السیاسۃ	القفطی	۶۴۶ھ
(۸) ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء	شاہ ولی اللہ	۱۱۷۲ھ

وغیرہ عربی میں۔ اردو میں مندرجۂ ذیل مشہور کتابیں:

(۱) اسلام کا سیاسی نظام	مولانا اسحٰق صدیقی
(۲) اسلام کا نظام حکومت	مولانا حامد انصاری
(۳) اسلام اور سیاسی نظریات	مفتی تقی عثمانی دامت برکاتہم۔ وغیرہ

اسلام کا نظریہ سیاست

اسلام کا نظریہ سیاست جاننے سے پہلے یہ بات ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ، اسلام نے انسان کو جن احکام کا مکلف کیا ہے، ان میں اس کے مقصدِ تخلیق کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھا ہے اور وہ ہے ''اللہ تعالی کی عبادت اس کی رضامندی کا حصول اور آخرت کی اصل کامیابی''۔ لہذا احکامِ شرعیہ کے مراتب اسی اعتبار سے ہیں، نہ اسلام نے سیاست کو اصل مقصد قرار دیا ہے اور نہ ضرورت سے خارج قرار دیا ہے، بلکہ مقصد کے اتمام کے لیے معین ہونے کی وجہ سے ضرورت کے زمرے میں رکھا ہے۔ لہذا سیاست نہ تو شریعت سے جدا ہے اور نہ شریعت کے مقاصد میں سے ہے ہاں اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے اور مقصدِ حیات کے حصول کے لیے وسیلۃ اور ذریعہ ہے۔ لہذا ضرورت ضرور ہے۔

جہاں شریعت نے سیاست کو ضرورت گردانا ہے، وہیں اسلامی شریعت نے اپنا نظریہ سیاست بشکل

خلافت واضح کر دیا ہے کہ اسلام کا سیاسی مسلک خلافت ہے۔

اسی لیے علماء نے قیام خلافت کی حتی المقدور کوشش کو مسلمانوں پر لازم قرار دیا ہے۔

طاقت کی صورت میں نظام خلافت قائم کرنا واجب ہے:

جب مسلمان علمی اور عملی طاقت سے بہرور ہوں تو نظام خلافت قائم کرنا واجب ہوتا ہے اور بادشاہی یا کوئی اور نظام قائم کرنا جائز نہیں اگر خدانخواستہ مسلمان علمی اور عملی میدان میں طاقت نہ رکھتے ہوں اور نظام خلافت قائم کرنے پر قادر نہ ہوں تو اس صورت میں پھر بادشاہی نظام قائم کرنا جائز ہے۔

حافظ ابن تیمیہؒ (متوفی ۷۲۸ھ) نے اس کے متعلق اسی طرح تحریر کیا ہے:

فصح الحجة بما ذكرنا الأصل الواجب لقوله (ﷺ) عليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين المهديين من بعدي تمسكوا بها وعضوا عليها بالنواجد، وإياكم ومحدثات الأمور، فكل بدعة ضلالة بعد قوله: من يعش منكم بعدي فسيرى إختلافا كثيرة۔

فهذا أمر وتحضيض على لزوم سنة الخلفاء، وأمر با لاستمساک بها، وتحذير من المحدثات المخالفة لها، وهذا الأمر منه، والنهي دليل بين في الوجوب۔

پس ہم استدلال کرتے ہیں کہ اصل کے اعتبار سے بادشاہی نظام قائم کرنا، بغیر عذر کے جائز نہیں ہے بلکہ نظام الخلافۃ علی منہاج النبوۃ قائم کرنا واجب ہے۔ دلیل نبی کریم (ﷺ) کا یہ فرمان ہے کہ "تم پر میرے بعد میرے خلفاء راشدینؓ کی سنت پر عمل کرنا لازم ہے، اس کو مضبوطی سے تھامے رکھ کر عمل کرو اور دین میں نئے امور سے بچو، دین میں ہر نیا عمل گمراہی ہے۔

نبی کریم (ﷺ) کا یہ فرمان مبارک اس فرمان کے بعد ہے، جس میں آپ (ﷺ) نے فرمایا کہ تم میں سے جو میرے بعد زندگی گزاریں گے وہ لوگ بہت زیادہ اختلاف دیکھیں گے۔ حدیث شریف میں خلفاء راشدینؓ کی سنت کے لزوم اور عمل کرنے کا حکم ہے، اسی طرح لوگوں کو ان امور سے جو خلفاء راشدینؓ کے طریقوں کے خلاف ہیں، منع کرنا ہے اور نبی کریم (ﷺ) کی جانب سے اتباع کا حکم اور مخالفت سے منع کرنا نظام خلافت کے وجوب پر ظاہری دلیل ہے۔ (اسلام کا نظام سیاست وحکومت: ج ۱ ص ۲۹)

نظام خلافت چھوڑنے کا حکم:

جب مسلمان اس بات پر قادر ہوں کہ نظام خلافت قائم کریں اور اس کے باوجود قائم نہ کریں، تو انہوں نے ایک واجب عمل چھوڑ دیا، جو کہ موجب عتاب ہے البتہ اس میں اختلاف ہے کہ یہ چھوٹا گناہ ہے یا بڑا؛ اگر چھوٹا گناہ ہو تو بادشاہ کی عدالت پر اثر انداز نہیں ہوگا۔ اور اگر بڑا ہو تو پھر اس میں علماء کی دو رائے ہیں۔ بعض علما فرماتے ہیں کہ یہ بادشاہت کی عدالت پر اثر انداز ہوتا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ اثر انداز نہیں ہوتا۔

حافظ ابن قیمؒ (متوفی ۷۲۸ھ) نے لکھا ہے:

وأما إذا كانت خلافة النبوة واجبة وهي مقدرة، وقد تركت: فترك الواجب سبب للذم والعقاب، ثم هل تركها كبيرة أو صغيرة؟ إن

یعنی جب خلافت نبوت واجب ہو اور اس کی قدرت بھی ہو، مگر چھوڑ دی گئی تو اس صورت میں واجب کا چھوڑنا قابل عتاب و مذمت ہے، پھر اس خلافت کا چھوڑنا بڑا گناہ ہے یا چھوٹا؟ اگر چھوٹا گناہ ہو تو یہ حاکم کی عدالت پر اثر انداز نہیں ہوگا اور یہ عیب نہیں ہے اور اگر بڑا گناہ ہو تو اس میں دو قول ہیں۔

(اسلام کا نظام سیاست و حکومت: ۳۳)

حکومت کا اسلامی تصور

شیخ الاسلام مفتی تقی صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں: سیاست و حکومت کے بارے میں اسلام نے جو احکام عطا فرمائے ہیں، وہ اس وقت تک اچھی طرح سمجھ میں نہیں آسکتے، جب تک حکومت کا صحیح تصور ذہن میں نہ ہو۔ اس گفتگو کے پہلے حصے میں ان مختلف نظریات کا جائزہ لیا گیا، جو حکومت کے آغاز اور اس کے مقاصد کے بارے میں مختلف فلسفیوں نے اپنے گمان اور اندازوں کے مطابق بیان کئے ہیں۔ ان کے مقابلے میں اسلام نے حکومت کا جو تصور پیش کیا ہے، وہ ان سب سے مختلف ہے، اس کو ٹھیک سمجھے بغیر اسلام کے سیاسی احکام کا پس منظر ذہن نشین نہیں ہوسکتا۔

اسلامی تصور کی بنیاد اللہ تعالی کی حاکمیت

اس تصور کی سب سے اہم بنیاد جسے اصل الاصول کہنا چاہیے یہ ہے کہ اس کائنات پر اصل حاکمیت اللہ

تبارک وتعالیٰ کو حاصل ہے، اور دنیا کے حکمراں اس حاکمیت کے تابع ہی حکومت کرسکتے ہیں۔

یہ وہ اصولی بنیاد ہے جس میں نہ تو اختلاف کی گنجائش ہے، نہ اجتہاد کی، نہ اس کو کسی مرحلے پر فراموش کیا جاسکتا ہے، اور نہ اس پر کسی قسم کی کوئی مفاہمت ہوسکتی ہے۔ یہ اسلامی سیاست کے دستور کی سب سے پہلی اور بنیادی دفعہ ہے جو قرآن کریم نے مختلف الفاظ میں دوٹوک انداز سے بیان فرمائی ہے:

{ان الحکم الا للہ} (الانعام:۵۷) "حاکمیت اللہ کے سوا کسی کی نہیں ہے۔"

{الا لہ الحکم} (الانعام:۶۲) "یاد رکھو! حاکمیت صرف اُسی کو حاصل ہے۔"

{الا لہ الخلق والامر} (الاعراف:۵۴) "یاد رکھو! تخلیق بھی اسی کی ہے اور حکم بھی اسی کا ہے۔"

{وللہ ملک السموت والارض} (ال عمران:۱۸۹) "اور آسمانوں اور زمین کی سلطنت اللہ ہی کو حاصل ہے۔"

{قل اللھم ملک الملک توتی الملک من تشاء} (ال عمران:۲۶) "کہو کہ یا اللہ! اے سلطنت کے مالک! تو جس کو چاہتا ہے، سلطنت بخشتا ہے۔"

یہ تمام آیات اس حقیقت کو واضح کررہی ہیں کہ حاکمیت اس کائنات میں صرف اللہ تعالیٰ کی ہے، جب کہ سیکولر جمہوریت میں حاکمیت کا حق عوام کے لیے تسلیم کیا گیا ہے۔ حاکمیت کے معنیٰ ہیں کسی دوسرے کا پابند ہوئے بغیر حکم جاری کرنے اور فیصلے کرنے کا کلی حق۔ یہ حق سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کو حاصل نہیں ہے، اور اگر کوئی شخص کسی اور کو اس معنیٰ میں حاکم قرار دیتا ہے تو درحقیقت وہ شرک کا ارتکاب کررہا ہے۔

اگرچہ تھیوکریسی کا اصل مطلب بھی یہی ہے کہ حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہے، لیکن میں پیچھے تفصیل سے عرض کرچکا ہوں کہ عیسائیت، یہودیت اور ہندو مذہب میں اس تصور کو ٹھیک نافذ کرنے کا کوئی راستہ نہیں تھا، اس لیے انہوں نے اسے بگاڑ کر مذہبی پیشواؤں کی حاکمیت میں تبدیل کردیا، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج جب تھیوکریسی کا نام لیا جاتا ہے، تو اس سے کوئی بھی اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا مفہوم نہیں سمجھتا، بلکہ اسے مذہبی پیشواؤں کی حاکمیت ہی سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ سیاست کی اردو کتابوں میں بھی اس کا ترجمہ مذہبی پیشوائیت کے نام سے کیا جاتا ہے، اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بجائے مذہبی پیشواؤں کو حاکمیت کا درجہ دیدینا وہ بدترین شرک ہے، جس کی مذمت قرآن کریم نے ان الفاظ میں فرمائی ہے:

{اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ} (التوبہ:۳۱) "ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ اپنے

عالموں اور درویشوں کو پروردگار بنالیا ہے۔"

لہٰذا جب ہم اسلامی سیاست کے اصل الاصول کے طور پر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ کا ذکر کرتے ہیں، تو یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ اس کا اس مذہبی پیشوائیت سے کوئی تعلق نہیں ہے، جس کو عیسائیت وغیرہ میں تھیوکریسی کے نام سے اپنایا گیا، اور وہ اس درجہ بدنام ہوگئی کہ اب لوگ اس کا نام سننے کو بھی تیار نہیں ہوتے۔ اس کے برعکس اسلام میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو اس کے صحیح مفہوم میں اختیار کیا گیا ہے، اور اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو ہدایات وحی کے ذریعہ بنی نوع انسان تک پہنچائی ہیں، چاہے "وحی متلو" کے ذریعہ ہوں یا وحی غیر متلو کے ذریعے، وہ اسلامی حکومت کا اولین ماٴخذ ہیں، اور حکومت ان کے خلاف نہ کوئی قانون بناسکتی ہے، اور نہ کوئی اقدام کرسکتی ہے۔

غرض اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا اقرار ہی وہ بنیاد ہے، جو اسلام کے تصور سیاست کو سیکولر جمہوریت سے بالکل الگ کردیتی ہے۔ سیکولر جمہوریت میں عوام کی نمائندہ ہونے کی حیثیت سے پارلیمنٹ اتنی مختار مطلق ہے کہ وہ جو چاہے قانون منظور کرسکتی ہے۔ اگر کسی ملک کے دستور نے پارلیمنٹ کے قانون سازی کے اختیارات پر کوئی پابندی عائد کی ہوئی ہے، تو اس پابندی کو بھی دستور میں ترمیم کرکے وہ جب چاہے ہٹاسکتی ہے۔ اس کے برخلاف اسلامی حکومت کا ناقابل تبدیلی دستور قرآن وسنت ہیں، جن سے ہٹ کر نہ وہ کوئی قانون بناسکتی ہے، اور نہ دستور کی کوئی ایسی دفعہ منظور کرسکتی ہے جو قرآن وسنت کے کسی حکم کے خلاف ہو۔

اہل مغرب کے تعصب کا حال یہ ہے کہ جب وہ کسی موضوع سے متعلق مختلف نظریات کی تاریخ بیان کرتے ہیں، تو ان میں اسلامی تعلیمات یا مسلمان مفکرین کی خدمات کا کوئی ذکر نہیں کرتے۔ سیاسی نظریات کی تاریخ میں بھی یہی ہوا ہے، کہ وہ سیاسی نظریات کی تاریخ ارسطو اور افلاطون سے شروع کرتے ہیں، اور پھر عیسائی دور پر پہنچنے کے بعد کئی صدیوں کی چھان لگا کر والٹائر، مونٹیسکو اور روسو پر پہنچ جاتے ہیں، اور اس بات کا کوئی ذکر تک نہیں کرتے کہ درمیان میں ایک طویل عرصہ اسلامی حکومتوں کا گذرا ہے، جس میں سیاست کا ایک مختلف تصور پیش کیا ہے۔ چنانچہ خدائی اصل کا نظریہ بیان کرتے ہوئے اس کے تحت صرف اس تھیوکریسی کی باتیں بیان کی جاتی ہیں؛ جو یہودیوں، عیسائیوں یا ہندوؤں کی تھیوکریسی سے متعلق ہیں، لیکن اس بات کا کہیں ذکر وفکر نہیں ہے کہ اسلام میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو کس طرح سیاست کی بنیاد بنایا گیا ہے، اور اس کے تحت جو خلافت راشدہ قائم ہوئی اور اس کے بعد بھی مسلمانوں نے جو حکومتیں قائم کیں، ان کی بنیادی کیا تھی؟ یہ درحقیقت اس تعصب کا

نتیجہ ہے، جو ان لوگوں کو مسلمانوں اور اسلام کے ساتھ رہا ہے، ورنہ اگر مؤرخانہ دیانت ہی پر عمل کرلیا جاتا، تو کم از کم ایک نظریہ کے طور پر تو یہ بات ذکر کی جاتی کہ اسلام کا تصور سیاست کیا ہے، اور اس کے تحت کس قسم کی حکومتیں قائم ہوئی ہیں؟

بہر حال! اللہ تعالیٰ کی حاکمیت پر ایمان وہ انتہائی اہم بنیاد ہے، جس کو تسلیم کرلینے کے بعد بہت سے حقائق خود بہ خود واضح ہوجاتے ہیں۔ اب آپ حکومت کے آغاز سے متعلق معاہدہ عمرانی ہی کے نظریے کو لے لیں، جسے حکومت کی ابتدا کے بارے میں سب سے زیادہ مقبول نظریہ سمجھا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کے اصول پر اس کی بالکلیہ نفی ہوجاتی ہے، اور اسی سے پتہ چلتا ہے کہ در حقیقت معاہدہ عمرانی کوئی چیز نہیں ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ یہ نظریہ محض ایسی ذہنی اختراع ہے، جس کا کوئی عملی ثبوت موجود نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ کون تھا جو معاہدہ عمرانی کے وقت موجود تھا؟ یہ معاہدہ کب ہوا تھا؟ کن قوموں کے درمیان ہوا تھا؟ کون اس کے ارکان تھے؟ ان سوالات کا جواب کوئی بھی اعتماد کے ساتھ نہیں دے سکتا۔ محض ایک تصور قائم کرلیا گیا ہے کہ شاید ایسا ہوا ہوگا۔ یہ وہی بات ہے جس کے بارے میں قرآن کریم فرماتا ہے:

{مالهم بذلك من علم ان هم الا يخرصون} (الزخرف:۲۰)

''ان لوگوں کو اس بات کا ذرا بھی علم نہیں ہے۔ ان کا کام اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ اندازے لگاتے ہیں۔''

اس کے برخلاف اللہ تعالیٰ کی حاکمیت ہی کا اصول صاف صاف یہ بتاتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا، تو اسی وقت یہ اعلان فرمادیا کہ:

{اني جاعل في الارض خليفة} (البقرۃ:۳۰)

اس کا مطلب یہ ہے کہ روئے زمین پر جو پہلے انسان آئے، یعنی حضرت آدم علیہ السلام وہ اللہ تعالیٰ کے خلیفہ بن کر آئے۔ حاکمیت اعلیٰ تو اللہ تعالیٰ کو حاصل تھی، اللہ تعالیٰ نے پہلے انسان کو اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا، تاکہ وہ حکومت کے اختیارات اللہ تعالیٰ ہی کی ہدایات اور احکام کے تابع رہ کر استعمال کرے۔ چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام پہلے حاکم تھے، اور باقی ان کے محکوم تھے، اسی طرح پہلے انسان کے ساتھ ہی حکومت وجود میں آگئی، لیکن اس حکومت کا اصل الاصول یہی تھا کہ حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہے، لہٰذا کوئی بھی حکم اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر نہیں چلایا جاسکتا، اور جو کوئی دنیا میں حاکم بنے، وہ در حقیقت اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ کا ماتحت اور اس کا نائب ہے، جسے خلیفہ کہتے ہیں۔ اسی لیے اسلام میں امیر المؤمنین کی حکومت کو خلافت اور خود اسے خلیفہ کہا جاتا ہے۔

خلافت کا مطلب

قرآن کریم میں خلافت یا خلیفہ کے الفاظ بہت سی جگہوں پر آئے ہیں۔ مفسرین کرام نے فرمایا: کہ خلافت الٰہیہ کے دو معنی ہیں۔ ایک معنی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت اور پابندی کرے، اور اللہ جل جلالہ کے اخلاق سے تشبہ اختیار کرے، جس کو "تخلق با خلاق اللّٰہ" کہا گیا ہے۔ اس معنی کے اعتبار سے مسلمان اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے، اور انسان سے مطالبہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی خلافت اسی معنی میں اختیار کرے۔

چنانچہ بیشتر مفسرین کا خیال یہ ہے کہ قرآن کریم میں جو فرمایا گیا ہے کہ: {انی جاعل فی الارض خلیفة} (البقرة:) وہ اسی معنی میں ہے، یہ خلافت انفرادی ہے، جس میں ہر انسان اس معنی میں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے کہ وہ اپنی پوری پوری زندگی میں اللہ تعالیٰ کے حکم کا پابند ہے اور "تخلق با خلاق اللّٰہ" کا مامور ہے۔

خلافت کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی جو صفتِ حاکمیت ہے، اس کو دنیا میں نافذ کرنے کے لیے کوئی اس کا نائب ہو، اور اللہ تعالیٰ کی نیابت اور خلافت میں لوگوں پر حکومت کرے۔ چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے قرآن کریم میں جو فرمایا گیا ہے کہ: {انا جعلنک خلیفة فی الارض} (ص:۲۶) یہ اس دوسرے معنی میں ہے۔ جب ہم سیاست کے اصول کے طور پر خلافت کا ذکر کرتے ہیں، تو ہمارا مقصود وہی دوسرے معنی ہوتے ہیں۔ اس دوسرے معنی کے لحاظ سے اسلام میں جو حاکم ہے، اس کے بارے میں بنیادی اصول یہ ہے کہ یہ حاکم بالذات نہیں ہے، بلکہ اللہ جل جلالہ کا خلیفہ ہے اور جب خلیفہ ہے، تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنی حکومت میں احکام الٰہیہ کا تابع ہوگا۔ یہیں سے اسلام کے تصورِ سیاست اور دوسرے نظریات کے درمیان ایک واضح حدِ فاصل قائم ہوجاتی ہے کہ لادینی نظاموں میں حکمران اپنے آپ کو احکام الٰہی کا پابند قرار نہیں دیتا، لیکن خلیفہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ احکام الٰہیہ کا پابند ہو کر احکام جاری کرے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے اصل خلیفہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفاء راشدینؓ آئے، وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے خلیفہ بنے، اس لیے انہوں نے اپنے آپ کو "خلیفة اللّٰہ" کے بجائے "خلیفة رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم" کہلوایا، چناں چہ ایک مرتبہ حضرت صدیق اکبرؓ کو کسی نے "یا خلیفة اللّٰہ" کہہ کر خطاب کیا تو آپؓ نے فرمایا: "لست خلیفة اللّٰہ، ولکنی خلیفة رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم"۔

اللہ تعالیٰ نے ابن خلدون کو عجیب ذہن عطا فرمایا تھا کہ، اس اللہ کے بندے نے مقدمہ میں ہر موضوع پر جو بحثیں کی ہیں، اور مقدمہ ایک ہی جلد میں ہے لیکن زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہیں چھوڑا جس پر اس میں

بحث نہ کی ہو۔اس موضوع پر بھی ابن خلدون نے مقدمہ میں لکھا ہے کہ حکومت کی تین قسمیں ہوتی ہیں:

(۱) ملک طبیعی (۲) ملک سیاسی (۳) اور خلافت۔

ابن خلدونؒ ملک طبیعی کی یوں تعریف کرتے ہیں: ''حمل الکافۃ علی مقتضی الغرض و الشہوۃ'' ملک طبیعی کسی حاکم کا اپنی غرض اور شہوت وخواہشات کے تقاضوں کے مطابق اپنی حکومت چلانا، جیسا کہ مطلق العنان بادشاہوں کا یہی طریقہ تھا۔

دوسری قسم ملک سیاسی ہے جس کی تعریف وہ یوں کرتے ہیں کہ: ''حمل الکافۃ علی مقتضی النظر العقلی فی جلب المصالح الدنیوۃ و دفع المضار'' یعنی ''تمام لوگوں کو اپنے عقلی نظریات کے مطابق دنیوی مصلحتوں کے حصول اور نقصانات سے بچانے پر مجبور کرنا۔'' سیکولر ڈیموکریسی اسی میں داخل ہے، کیوں کہ اس کے پاس کوئی ابدی قدر تو ہے نہیں، اس لیے عقلی اعتبار سے جس کو بہتر سمجھا اس کو اختیار کر لیا۔

تیسری قسم خلافت ہے، جس کی تعریف ابن خلدون اس طرح کرتے ہیں کہ ''حمل الکافۃ علی مقتضی النظر الشرعی فی مصالحھم الاخرویۃ والدنیویۃ الراجعۃ الیھا'' یعنی لوگوں کو شرعی طرز فکر کے مطابق چلانا، جس سے ان کی آخرت کی مصلحتیں بھی پوری ہوں اور وہ دنیوی مصلحتیں بھی جن کا نتیجہ آخر کار آخرت ہی کی بہتری ہوتا ہے۔''

اگر دیکھا جائے تو حکومت کی ساری صورتیں ان تین قسموں میں سمٹ آئی ہیں۔ایک روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت فاروق اعظمؓ نے لوگوں سے فرمایا کہ مجھے پتہ نہیں میں بادشاہ ہوں یا خلیفہ ہوں؟ ایک صاحب مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے، انہوں نے کہا کہ امیر المؤمنین! دونوں میں فرق ہے۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: کیا فرق ہے؟ انہوں نے جواب دیا: فرق یہ ہے کہ خلیفہ وہ ہے کہ جو کچھ لیتا ہے، برحق لیتا ہے، اور اسے برحق جگہ پر ہی رکھتا ہے، اور رہا بادشاہ وہ ہوتا ہے جو لوگوں پر ظلم کرتا ہے اور ایک سے لے کر دوسرے کو دیتا ہے، اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ خاموش ہو گئے۔ظاہر ہے کہ برحق لینے اور برحق دینے میں حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کی ادائیگی شامل ہے۔لہٰذا تمام حقوق کو اپنے اپنے مواقع پر ادا کرنے والا ہی ہوگا، جو اللہ تبارک و تعالیٰ کے احکام کا تابع وفرمانبردار ہو۔اسی کا نام خلافت ہے۔

مقاصد حکومت

آج حکومت کے جو مقاصد بیان کیے جارہے ہیں وہ کیا ہیں؟ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو خوشی فراہم کرنا

، اور ان کے حقوق کا زیادہ سے زیادہ تحفظ کرنا۔ لیکن آپ نے دیکھا ہوگا کہ مروجہ نظریات میں کوئی نظریہ سیاست یہ نہیں کہتا کہ حکومت کے مقاصد میں یہ بات بھی داخل ہے کہ وہ عوام کی تربیت کرے، نیکی کو فروغ دے، اور برائی کو روکے۔ یہ بات کسی نظام حکومت یا سیاسی نظریہ میں موجود نہیں ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اچھائی یا برائی کا تو ان نظریات میں کوئی مستقل تصور ہی نہیں ہے۔ آج کے فیشن ایبل فلسفیوں میں اچھائی اور برائی تو محض ایک اضافی اصلاح (relative term) ہے۔ یعنی معاشرہ اپنے رواج کے ذریعہ خود یہ طے کرتا ہے کہ کونسی چیز اچھی اور کونسی بری ہے اور ضروری نہیں کہ جس چیز کو کبھی برا کہا گیا تھا، وہ آج بھی بری سمجھی جائے، بلکہ اگر معاشرے میں اس کا چلن عام ہو جائے اور لوگ اسے اچھا سمجھنے لگیں تو وہی بری چیز اچھی ہو جائے گی۔ نیز ایک ملک میں اگر کسی چیز کو لوگ اچھا سمجھتے ہیں تو ضروری نہیں کہ دوسرے ملک میں بھی اسے اچھا سمجھا جائے۔ خلاصہ یہ کہ خیر مطلق اور شر مطلق کا کوئی تصور ہی موجود نہیں ہے، اس لیے حکومت کے مقاصد میں اچھائی یا نیکی کے فروغ اور بدی سے اجتناب کا کوئی ذکر نہیں آتا۔

اس کے برخلاف اسلام میں چونکہ اچھائی اور برائی کا جچا تلا معیار یہ موجود ہے کہ، جس چیز کو اس کائنات کے خالق نے اچھا قرار دیا، وہ اچھی اور جسے اس نے برا قرار دیا وہ بری ہے، اس لیے نظام خلافت میں حکومت کے بنیادی مقاصد میں سب سے پہلے یہ بات داخل ہے کہ حکومت اچھائی کو پھیلانے اور برائی کو روکنے کا فریضہ انجام دے۔ چنانچہ حکومت کے مقاصد کھول کھول کر بیان فرما دیے گئے ہیں۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

{الذين ان مكنهم في الارض اقاموا الصلوة و اتوا الزكوة بالمعروف و نهوا عن المنكر و لله عاقبة الامور} (الحج:۴۱) "یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین میں اقتدار عطا کریں تو یہ نماز قائم کریں، اور زکوۃ ادا کریں، اور نیکی کا حکم دیں اور برائی سے روکیں اور تمام معاملات کا انجام اللہ ہی کے قبضے میں ہے۔"

قرآن کریم نے اس طرح واضح فرما دیا ہے کہ حکومت کے مقاصد محض یہ نہیں کہ خوشی حاصل ہو، جیسے کہ حکومت کے بعض نظریات میں کہا گیا ہے، کیوں کہ خوشی تو ایک مبہم چیز ہے، اور مختلف طبیعتوں کے لحاظ سے مختلف چیزوں میں خوشی حاصل ہو سکتی ہے۔ چنانچہ مجرم ذہنیتوں کو جرم کر کے خوشی حاصل ہوتی ہے، لہٰذا یہ ایک ڈھیلا ڈھالا لفظ ہے۔ جس میں ہر برائی کو چھپایا جا سکتا ہے۔

قرآن کریم نے ایک اچھی حکومت کے جو مقاصد بیان فرمائے ہیں، ان پر غور کیا جائے تو درحقیقت وہی حکومت کے اصل مقصد کو پورا کرتے ہیں۔ (اسلام اور سیاسی نظریات: ص ۱۷۳ تا ۱۸۱)

اللہ کی حاکمیت کے ساتھ ساتھ ۲-اقامت صلوۃ ۳-ادائیگی زکوۃ ۴-امر بالمعروف نہی عن المنکر ۵-عدل وانصاف کا قیام بھی مقاصد حکومت میں سے ہے۔

مگر صورتِ حال اس وقت کچھ ایسی ہے کہ دنیا میں کہیں بھی خلافت اور اسلامی حکومت کا وجود نہیں اور اس کے لیے جو سعی اور کوشش ہے، وہ بھی نہ ہونے کے برابر ہے۔ ۱۹۲۴ء میں کمال اتاترک نے خلافتِ عثمانیہ کو ساقط کر دیا، جو گذشتہ صدی کا سب سے بڑا المناک واقعہ تھا اس کے بعد ۱۹۶۷ء میں مسجد اقصی اور فلسطین بھی مسلمانوں کے ہاتھوں سے جاتا رہا، مگر افسوس کے بدستور مسلمان غفلت کی نیند سو رہا ہے، اللہ ہمیں اسلامی خطوط پر انفرادی و اجتماعی سطح پر زندگی گزارنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

بہر حال اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ، جب دنیا میں جمہوریت کا بول بالا ہے اور مسلمانوں کے قیام خلافت کے کوئی قریبی آثار نہیں، جبکہ مسلمان دنیا میں تقریباً ۳۰ رفیصد ہیں۔ گویا ثلث اور وہ بھی دنیا کے دو سو سے زائد ملکوں میں پھیلے ہوئے ہیں، کہیں برائے نام اسلامی حکومت ہے کہیں بادشاہت اور اکثر و بیشتر مقامات پر جمہوریت ہے، تو ان حالات میں مسلمانوں کے لیے جمہوریت سے کنارہ کش ہونا چاہیے؟ یا جمہوریت میں بدرجۂ مجبوری حصہ دار اور شریک ہو جانا چاہئے، تو اس سلسلہ میں قریب قریب علما کا اجماع ہے کہ کنارہ کشی مسلمانوں کے لیے مزید باعث ہلاکت ہے، لہذا بدرجۂ مجبوری، اضطراری کیفیت کی وجہ سے جمہوری انتخابات میں شرکت کرنا مسلمانوں کے لیے ناگزیر ہو چکا ہے۔ عبد الرحمن کیلانی صاحب مرحوم تحریر فرماتے ہیں کہ "انتخابات میں شرکت بہر حال مجبوری ہے"۔ مسلمانوں کو یہ تلخ فریضہ اس لیے انجام دینا پڑتا ہے کہ دین بیزار اور خراب عناصر کے راستہ کو بالکل آزاد نہ چھوڑ دیا جائے، بلکہ اس بے دینی اور بدعنوانی کے سیل رواں کے سامنے حتی المقدور جہاں تک ہوسکے رکاوٹیں کھڑی کرنا چاہتے ہیں، گویا انتخابات میں شرکت ایک دفاعی طریقہ کار ہے۔ اور اھون البلیتین کے نظریہ اور اصول کے پیش نظر حصہ لینا گوارہ کر لیا جائے، اگر (مسلمان) انتخابات میں حصہ نہ لیں، تو اس کا نقصان اس سے بھی زیادہ خطرناک ہوگا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ، جو سیاسی اور دینی رہنما جمہوری طرز انتخاب کو غیر اسلامی قرار دیتے ہیں، وہ خود کیوں انتخابات میں حصہ لیتے رہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ لوگ برضا و رغبت الیکشن میں حصہ نہیں لیتے، بلکہ بامر مجبوری انھیں یہ تلخ فریضہ سرانجام دینا پڑتا ہے، تاکہ دین بیزار اور خراب عناصر کے راستہ کو بالکل آزاد نہ چھوڑ دیا جائے۔ بلکہ اس بے دینی اور بدعنوانی کے سیل رواں کے سامنے جہاں تک ہوسکے رکاوٹیں کھڑی کرنا چاہئے۔ گویا ان لوگوں کا انتخاب میں حصہ لینا ایک دفاعی طریقہ کار ہے۔ اھون البلیتین کے نظریہ کے پیش نظر

انتخابات میں حصہ لینا اس لئے گوارا کرلیا گیا کہ اگر انتخاب میں حصہ نہ لیا جائے تو اس کا نقصان اس سے بھی زیادہ ہے۔(خلافت و جمہوریت :ص ۲۲۶)

تو آیئے !اب جمہوریت کی حقیقت اور اس کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہیں:

مغربی جمہوریت کی تعریف اور تعارف

جمہوریت کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں جن میں سے ابراہیم لنکن، ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے سولھویں صدر، کی تعریف زیادہ جامع قرار دی گئی ہے اور وہ یوں ہے:۔

GOVERNMENT OF THE PEOPLE, BY THE PEOPLE, FOR THE PEOPLE

یعنی ’’عوام پر عوام کی حکومت، عوام کی مرضی سے‘‘!

گویا عوام کو یہ ذہن نشین کرایا جاتا ہے کہ یہ حکومت اُن کی اپنی ہی ہے اور ان پر کسی دوسری حاکمیت کا دباؤ نہیں ہے۔اور اس کا طریق کار یہ ہے کہ عوام میں سے ہر بالغ مرد اور عورت اپنا نمائندہ منتخب کرنے کا حق رکھتا ہے؛ تاکہ یہ منتخب نمائندے اُن پر حکومت کریں اور اُن کے لیے قانون بنائیں۔

جمہوریت کی دو قسمیں بتائی جاتی ہیں:

۱-بلاواسطہ جمہوریت: جس میں تمام شہری بلا واسطہ حکومت کے انتظام میں حصہ لے سکیں، یہ قدیم یونان اور رُوما کی شہری ریاستوں میں پائی جاتی تھی، ایسا نظام چونکہ صرف ایک چھوٹی سی ریاست میں قائم ہوسکتا ہے، لہٰذا آج کے دَور میں یہ ناقابلِ عمل ہے، سوائے سوئزرلینڈ کے چند علاقوں اور امریکہ کی بعض میونسپلٹیوں کے اور کسی جگہ نہیں پایا جاتا ہے۔

۲-بالواسطہ جمہوریت: اس میں عوام ایک معینہ عرصے کے لیے اپنے نمائندے منتخب کرکے مجلسِ قانون سازی کی تشکیل کرتے ہیں، جو ملک کے لیے قانون بناتی ہے، جمہوریت کی یہی قسم آج کل رائج ہے۔

پارلیمانی اور صدارتی نظام کیا ہے؟

جمہوری حکومتوں میں اگر عاملہ اور مجلس قانون ساز آپس میں متحد ہوں اور مشترکہ طور پر ایک ہی جماعت کے زیر نگرانی کام کرتے ہوں تو اُسے وزارتی یا پارلیمانی طرزِ حکومت کہتے ہیں، اس میں صدر کی

حیثیت ایک آئینی سربراہ کی ہوتی ہے، تمام اختیارات وزیرِاعظم کو ہوتے ہیں، اور اگر عاملہ اور مقننہ علیحدہ اور آزاد ہوں تو ایسی طرزِ حکومت کو صدارتی کہا جاتا ہے، اس صورت میں وزیرِاعظم اور صدر کے اختیار تقریباً برابر ہیں۔ صدارتی کابینہ میں حزبِ اختلاف کا نمائندہ بھی حصہ لے سکتا ہے، جبکہ پارلیمانی نظام میں یہ صورت نہیں ہوتی۔

(خلافت و جمہوریت، ص ۱۹۶، ۱۹۷)

جمہوریت کا موجودہ دَور انقلاب فرانس ۱۷۷۹ء سے شروع ہوتا ہے، واقعہ باسٹیل کے بعد ۴ راگست ۱۷۷۹ء کی شب کو جمعیت وطنیت فرانس نے اپنا مشہور منشور انقلاب شائع کیا تھا، جس نے تاریخ میں اولین فرمانِ حریت کے لقب سے جگہ پائی، مشہور فرانسیسی مورخ حال (CH SEGNOBOS) نے اپنی تاریخ انقلاب میں اس منشور کا خلاصہ درج ذیل پانچ دفعات میں پیش کیا ہے:

۱- استیصالِ حکم ذاتی: یعنی حق حکم و ارادہ اشخاص کی جگہ افراد کے ہاتھ میں جائے، شخص ذات اور خاندان کو تسلط و حکم میں کوئی دخل نہ ہو، یعنی ملک ہی پریذیڈنٹ کا انتخاب کرے، اسی کو حقِ عزل و نصب ہو۔

۲- مساوات عامہ: جس کی بہت سی قسمیں ہیں۔

مساواتِ جنسی، مساوات خاندانی، مساواتِ مالی (حقِ ملکیت) مساواتِ قانونی، مساوات ملکی و شہری وغیرہ وغیرہ، اس بنا پر بھی پریذیڈنٹ کو عام باشندگانِ ملک پر کوئی تفوق و ترجیح نہ ہو۔

۳- خزانہ ملکی: ملک کی ملکیت ہو، اس پر پریذیڈنٹ کو کوئی ذاتی تصرف نہ ہو۔

۴- اُصولِ حکومت: "مشورہ" ہو، اور قوتِ حکم و ارادہ افراد کی اکثریت کو ہو، نہ کہ ذات و شخص کو۔

۵- حریت: رائے و خیال اور مطبوعات پریس کی آزادی اسی کے تحت ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ موجودہ جمہوریت ملوکیت کی دوسری انتہا اور اس کی عین ضد ہے، اب ان پانچوں دفعات کی تحصیل کیجئے تو آخر میں صرف ایک ہی عنصر بسیط باقی رہے گا، یعنی قوت حکم و ارادہ اشخاص و ذات کے ہاتھ میں نہ ہو بلکہ جماعت و افراد کے تسلط میں ہو۔

مختصر الفاظ میں اس کی تعبیر اس ایک جملہ میں ہو سکتی ہے "نفی حکم ذاتی و مطلق" باقی چار دفعات میں جو اُمور بیان کیے گئے ہیں، وہ سب کے سب اس کے ذیل میں آجاتے ہیں، مساوات حقوق مالی و قانونی، اساس مشورہ و انتخاب، عدم اختیار و تصرف خزانہ ملکی و حریت آرا و مطبوعات وغیرہ سب "نفی حکم ذاتی و مطلق" ہی کی تفسیر ہیں۔

مندرجہ بالا دفعات کا مطالعہ کرنے سے یہ واضح ہو جاتا ہے، کہ بادشاہت کی دشمنی کے جوش میں اگر

کچھ بادشاہت کے اُصول اچھے بھی تھے، تو جمہوریت پسندوں نے اس کی بھی مخالفت کو اپنا فرض سمجھ کر افراد کو بے لگام قسم کی آزادی کی بشارت دے دی۔

حقیقی جمہوریت اور عوامی حقوق

اس اعلان اور اس کی دفعات پر تبصرہ کرنے سے پیشتر یہ متعین کرلینا ضروری ہے کہ حقیقی جمہوریت ہے کیا؟ کاروبارِ مملکت میں عوام کی عدم مداخلت کا نام شخصی حکومت یا ملوکیت ہے اور جس حکومت میں عوام کی مداخلت جس قدر بڑھتی جائے گی، اسی قدر ہی وہ جمہوری حکومت کہلانے کی مستحق ہوگی، بالفاظِ دیگر رئیس مملکت کے (اور اسی طرح دوسرے حکام یا اولوالامر کے) اختیارات و امتیازات خواہ معاشرت سے تعلق رکھتے ہوں یا معیشت سے جس قدر زیادہ ہوں گے اسی قدر وہ حکومت مائل بہ ملوکیت سمجھی جائے گی اور اس میں عوام کے حقوق کم ہوتے جائیں گے اور رئیس مملکت کے اختیارات جس قدر محدود ہوں گے، وہ حکومت مائل بہ جمہوریت سمجھی جائے گی، اور اس میں عوام کے حقوق کی نگہداشت زیادہ ہوگی۔ (خلافت و جمہوریت، ص ۱۶۵ تا ۱۶۶)

جمہوریت کی مزید تفصیل شیخ الاسلام حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب کی تحریر سے ملاحظہ فرمائیں۔

جمہوریت ...... نظریاتی پہلو

ہمارے دور میں جمہوریت کو ہی سب سے بہتر نظام سیاست قرار دیا گیا ہے، اور جمہوریت پر ایمان لانا آج کی سیاست کا کلمہ طیبہ بن چکا ہے، کوئی شخص جمہوریت پر اعتراض کی زبان کھولے تو وہ سیاست کی اصطلاح میں کافر سے کم نہیں۔ اس لیے اس کو قدرے تفصیل کے ساتھ سمجھنا ضروری ہے۔

(۱) جمہوریت کیا چیز ہے؟

(۲) جمہوریت کے بنیادی نظریات کیا ہیں؟

(۳) کس طرح وہ دنیا میں متعارف ہوئی؟

(۴) کون سے ادارے اس نے قائم کیے؟

(۵) اور اس کی مختلف شکلیں جو دنیا میں مشہور و معروف ہیں یا رائج ہیں وہ کیا کیا ہیں؟

جمہوریت کا لفظ درحقیقت ایک انگریزی لفظ ''Democracy'' کا ترجمہ ہے اور انگریزی میں بھی یہ یونانی زبان سے آیا ہے۔

اور یونانی زبان میں ''Demo'' عوام کو کہتے ہیں۔ ''Cracy'' یونانی زبان میں حاکمیت کو کہتے ہیں۔ اسی لیے عربی میں جب اس کا ترجمہ کیا گیا ہے تو اسے ''دیمقراطیہ'' کہا گیا۔ عربی زبان میں جمہوریت نہیں

بولتے۔ہم اردو میں جب ''Democaracy'' کا ترجمہ کرتے ہیں، تو جمہوریت کہتے ہیں، لیکن عربی میں ''جمہوریت'' کے لفظ سے یہ مفہوم کوئی نہیں سمجھے گا۔بہر حال! جمہوریت کا بنیادی تصور یہ ہے کہ حاکیت کا حق عوام کو حاصل ہے۔لہٰذا جمہوریت کے معنی ہوئے ایسا نظامِ حکومت جس میں عوام کو یا عوام کی رائے کو کسی نہ کسی شکل میں حکومت کی پالیسیاں طے کرنے کے لیے بنیاد بنایا گیا ہو۔ویسے جمہوریت کی جامع ومانع تعریف میں بھی خود علماء سیاست کا اتنا زبردست اختلاف ہے کہ ایک کی تعریف دوسرے سے ملتی نہیں ہے، لیکن بحیثیت مجموعی جو مفہوم ہے، وہ یہی ہے کہ اس سے ایسا نظام حکومت مراد ہے، جس میں عوام کی رائے کو کسی نہ کسی شکل میں حکومت کی پالیسیاں طے کرنے کی بنیاد بنایا گیا ہو۔

اپنے اجمالی مفہوم کے ساتھ یہ جمہوریت صرف اس دور کی پیداوار نہیں ہے، بلکہ یونان میں بھی جمہوریت موجود رہی ہے، اور جیسا کہ میں نے آپ سے عرض کیا تھا، سیاست پر افلاطون کی کتاب کا نام ہی جمہوریت ہے، لیکن وہاں جمہوریت کا جو تصور تھا وہ نسبتاً سادہ اور محدود تھا۔سادہ اس معنی میں کہ یونان میں جو ریاستیں تھیں، وہ شہری ریاستیں کہلاتی تھیں۔

یہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں، چھوٹے چھوٹے شہروں پر مشتمل ایک شہر ایک مستقل حکومت ہوا کرتا تھا، دوسرا شہر دوسری مستقل حکومت، اور تیسرا شہر تیسری مستقل حکومت ہوا کرتا تھا، اور شہر بھی زیادہ بڑے نہیں ہوتے تھے، یونان کا سب سے بڑا شہر ایتھنز تھا، جو آج بھی اسی نام سے مشہور ہے اور اس کی زیادہ سے زیادہ آبادی اس دور میں دس ہزار افراد پر مشتمل تھی، اور جو شہر تھے، مثلاً اسپارٹا ''Sparta'' وغیرہ وہ اور چھوٹے تھے۔چھوٹی سی حکومت ہے اور چھوٹا سا ملک ہے، تھوڑی سی آبادی ہے۔اگر فرض کرو کہ دس ہزار آدمی بھی تصور کر لیے جائیں اور ایک مرتبہ ان کو جمع بھی کر لیا جائے، تو ایک میدان میں وہ جمع ہو سکتے ہیں۔لہٰذا وہاں جمہوریت کا تصور یہ تھا کہ بادشاہ خاص خاص بڑے بڑے فیصلوں کے سلسلوں میں عوام کی رائے معلوم کرنے کے لیے ساری آبادی کو اکٹھا کر لیتا تھا۔اب ساری آبادی کسی ایک میدان میں اکٹھی ہوگئی ہے، اور ان کے سامنے ایک بات رکھی جاتی ہے، کہ ہم یہ کام کرنا چاہتے ہیں یا یہ پالیسی بنانا چاہتے ہیں، آپ کی کیا رائے ہے؟ کچھ لوگوں نے کھڑے ہو کر تائید کر دی اور کچھ لوگوں نے تردید کر دی، کچھ بحث ومباحثہ بھی ہوگیا، آخر میں اتنا ہی لوگوں سے ہاتھ کھڑے کر کے اس بات پر منظوری لے لی گئی۔وہاں کا نظام انتہائی سادہ تھا۔اس کے لیے کوئی خاص ایسا دستور نہیں ------منظوری لی جائے گی، اور فلاں معاملے میں نہیں لی جائے گی اور فلاں معاملے میں بادشاہ کو بغیر منظوری کے کام کرنے کا حق ہوگا، اور فلاں معاملے میں نہیں ہوگا۔بادشاہ خود اپنی صوابدید کے مطابق یہ دیکھتا

ہے کہ کونسا مسئلہ ہے، جس پر لوگوں سے رائے لینی چاہیے، پھر ان کو جمع کر کے ان کی رائے معلوم کر لیتا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ اس مشورے میں تھوڑا سا انضباط بھی پیدا کیا گیا، اور اس کے لیے تھوڑے بہت قوانین بھی بنائے گئے، لیکن وہ قوانین بہت زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ زیادہ تر جمہوریت کا نقشہ ایسا ہی سادہ قسم کا تھا۔ لیکن یہ بات بالکل بدیہی ہے کہ ساری آبادی اکٹھا کر کے اس سے پالیسی کے بارے میں رائے معلوم کرنے کا طریقہ اسی جگہ چل سکتا ہے، جہاں کوئی ملک بہت چھوٹا ہو اور آبادی تھوڑی ہو۔ جب ملک بڑا ہوگا اور آبادی بڑی ہوگی تو وہاں پر سب لوگوں کو اکٹھا کرنا ممکن نہیں رہے گا۔ چنانچہ جو ملک بڑے بڑے قائم ہوئے، جیسے روم کی سلطنت اس کی حدودِ سلطنت بڑی وسیع تھیں اور آبادی بہت زیادہ تھی، تو وہاں یہ صورت ممکن نہیں تھی، جو یونان کی شہری ریاستوں میں ممکن ہوئی۔ لہٰذا وہاں جمہوریت کا تصور اس حد تک محدود ہو گیا کہ بادشاہ اپنے مشورے کے لیے کوئی کونسل یا مجلس شوریٰ بنا لیتا تھا۔ اور وہ مجلس شوریٰ سے کبھی مشورے بھی طلب کیا کرتا تھا۔

اس کا نتیجہ رفتہ رفتہ یہ نکلا کہ جمہوریت کا یہ تصور کہ عوام کو پالیسیوں میں حصہ دار بنایا جائے، عملاً مفقود ہوتا چلا گیا اور اس کی جگہ مطلق العنان بادشاہت وغیرہ نے لے لی۔

لہٰذا یونان کی ریاستوں کی بعد جمہوریت کا تصور ختم ہو گیا۔ پھر اس تصور کا احیاء ۱۸ رہویں صدی کے آغاز میں ہوا، اور اس وقت جمہوریت نے ایک منضبط شکل اختیار کی اور وہ جمہوریت وجود میں آئی، جو آج جمہوریت کہلاتی ہے، جس کا نام ''Liberal Democracy'' ہے اس کو آپ اردو میں آزاد خیال جمہوریت کہہ سکتے ہیں۔ اب دنیا میں اسی ''Liberal Democracy'' کا چلن ہے۔ (اسلام اور سیاسی نظریات: ۸۰ تا ۸۲)

جمہوریت کا فلسفہ اور فکری بنیادیں

یورپ میں نشأۃ ثانیہ کے بعد ایک فکر آزادی کا دور شروع ہوا۔

اس سے پہلے کلیسا نے سب کو باندھا ہوا تھا، اور کلیسا کے بیان کیے ہوئے نظریات اور افکار سے سرِ مو اختلاف کرنے والے کو بدعتی قرار دیکر تشدد کا نشانہ بنایا جاتا تھا، بلکہ بعض اوقات زندہ جلا دیا جاتا تھا۔ لیکن یورپ کی نشأۃ ثانیہ کے بعد جب ان کے پاس اندلس وغیرہ سے علوم منتقل ہونا شروع ہوئے، تو پھر لوگوں میں اپنے طور پر خود سوچنے کا رجحان پیدا ہوا، اور اگرچہ چرچ کا اختیار اس وقت بھی سیاسی طور پر بڑا مستحکم تھا، اور جن لوگوں نے سوچ کی نئی راہیں نکالنے کی کوشش کی، ان کو چرچ کی طرف سے فی الجملہ بڑی مصیبتوں کا بھی شکار ہونا پڑا۔ لیکن یہ تحریک جو آزاد خیالی کی تحریک تھی، باوجود ظلم وستم کے چلتی رہی، رفتہ رفتہ چرچ کے خلاف ایک نفرت کی فضا پیدا ہوتی گئی، اور دھیرے دھیرے چرچ کا اقتدار بھی کم ہو گیا، چنانچہ زندگی کے مختلف شعبوں میں مختلف مفکرین پیدا ہوئے، جنہوں نے چرچ کے بنائے ہوئے غیر فطری نظام سے بغاوت کر کے نئے افکار لوگوں میں پھیلانے شروع

کیے۔

یہاں دوسرے موضوعات سے ہمیں بحث نہیں، لیکن مغربی دنیا میں جمہوریت کی صورت گری جن مفکرین نے کی، اور جن کو جدید آزاد خیالی جمہوریت کا بانی سمجھا جاتا ہے، وہ تین فلسفی ہیں جنہوں نے "Liberal Democracy" کی داغ بیل ڈالی، ایک وولٹائر (Voltire) دوسرا (Montesquie) تیسرا روسو (Rousseau) یہ تین افراد ہیں، جنہوں نے اپنے اپنے نظریات اور فلسفے کی بنیاد پر ایسے افکار دنیا میں پھیلائے جس کے نتیجہ میں جمہوریت وجود میں آئی۔ یہ تینوں اشخاص فرانس کے ہیں۔

ان میں جو سب سے پہلا شخص ہے، یعنی وولٹائر، یہ ۱۷/رہویں صدی کے آخر میں پیدا ہوا تھا، اور ۱۸/ویں صدی میں اس کا انتقال ہوا۔ اس نے فلسفے، سائنس اور آرٹ کے ہر شعبے میں کتابیں بہت لکھی ہیں، اور اس کی تحریروں کا مجموعہ تقریباً ۹۰/جلدوں میں شائع ہوا ہے۔ وولٹائر کا خصوصی امتیاز یہ ہے کہ اس نے مذہب کے بخیے ادھیڑے، اور یہ دعویٰ کیا کہ جتنے آسمانی مذاہب ہیں، سب تحریف شدہ ہیں، اور اصل میں انسان کا ایک ہی مذہب ہونا چاہیے اور وہ فطری مذہب ہے۔ اس کو انگریزی میں Natural Religion کہتے ہیں۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ وولٹائر نے خدا کے وجود میں تشکیک کا بیج بویا ہے، لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ اس نے یہ کہا کہ انسان کا ایک فطری مذہب ہونا چاہیے، اس کے تحت انسان پیدا ہونے کے بعد خدا کے وجود کو تسلیم کرلے تو کرلے۔ اس کے بعد عام مذہب میں جو اخلاقی یا قانونی ہدایات دی جاتی ہیں، ان کی اور مذہبی نظاموں کی کوئی دائمی حیثیت نہیں ہے۔

وولٹائر کے نظریات کی دوسری بات جو سب سے زیادہ موثر ہوئی، وہ یہ کہ مذہب انسان کا ذاتی معاملہ ہے اور کوئی اتھارٹی دوسرے کو کسی مذہب کے حق اور باطل ہونے کا قائل نہیں کرسکتی۔ بلکہ یہ انسان کا ذاتی معاملہ ہے، وہ اگر چاہے تو بت پرستی کرے اور اگر چاہے تو آسمانی مذہب اختیار کرے اور چاہے تو یہودی بن جائے یا عیسائی بن جائے، یہ اس کا ذاتی معاملہ ہے۔ اس میں نہ چرچ کو دخل اندازی کی ضرورت ہے اور نہ حکومت یعنی State کو، حکومت کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اسی نظریہ نے آگے بڑھ کر یہ شکل اختیار کرلی کہ آج مغربی دنیا میں زیادہ تر مذہب کے بارے میں جو تصور ہے، وہ یہ ہے کہ مذہب میں حق اور باطل کا کوئی سوال نہیں ہے کہ کون سا مذہب حق ہے اور کونسا باطل ہے؟ بلکہ مذہب انسان کی ذاتی تسکین کا ذریعہ ہے۔

یعنی مذہب ایک ایسی چیز ہے، جس کے ذریعہ انسان اپنے نفس اور روح کو تسکین دیتا ہے۔ اگر اس کو

نماز پڑھنے میں تسکین ملتی ہے، تو اس کے لیے وہی برحق ہے، اور اگر کسی کو بت کے سامنے ہاتھ جوڑنے میں تسکین ملتی ہے، تو اس کے لیے وہی برحق ہے، اور اگر کسی کو مراقبہ میں تسکین ہوتی ہے، تو اسے مراقبہ ہی کرنا چاہیے۔ اس کے وجود کو جو مذہب بھی تسکین دیتا ہو، اس کے لیے وہی برحق ہے۔ لہٰذا مذہب میں حق اور باطل کا سوال نہیں ہے۔ یہ نقطہ نظر ہے جو آج پورے مغرب میں پھیلا ہوا ہے، چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ مذہب چوں کہ ایک ذاتی معاملہ ہے، اور ہر شخص کو اختیار ہے کہ اپنی تسکین کے لیے جو مذہب چاہے اختیار کرے، اس لیے ہر شخص کو دوسرے کے مذہب کا احترام کرنا چاہیے اور رواداری سے کام لینا چاہیے۔ اس میں بحث ومباحثہ کرکے ایک دوسرے کو قائل کرنا اور مناظرہ کرنا بیکار ہے۔ دوسرے کے مذہب کا احترام بھی اس بنیاد پر نہیں کہ مذہب فی نفسہ کوئی قابل احترام چیز ہے، بلکہ اس لیے کہ ایک آدمی نے اپنی تسکین کے لیے وہ ذریعہ اختیار کیا ہے، لہٰذا تم اس کا احترام کرو، جیسا کہ کسی شخص نے اپنی تسکین کے لیے مکان بنایا تو آپ کے ذمے یہ فرض ہے کہ اس کا احترام کریں، اس کے مکان کی چاردیواری میں بلا اجازت داخل نہ ہوں۔ اسی طرح کسی شخص نے اپنا مذہب اختیار کیا ہے۔ وہ مذہب اس کا ذاتی معاملہ ہے آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ آپ اس کی تردید کریں۔

جب یہ بات طے ہوگئی کہ مذہب ذاتی معاملہ ہے، اور ذاتی تسکین کا ذریعہ ہے، اس لیے اس کا ریاست اور حکومت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ چنانچہ حکومت کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ اسی سوچ کی بنیاد پر سیکولرازم کا نظریہ پیدا ہوا۔ سیکولرازم کا نام تو آپ نے سنا ہوگا۔ اس کے لفظی معنیٰ ''دنیاوی'' ہیں۔ سیکولر کہتے ہیں ہر اس چیز کو جو دنیاوی مصالح اور دنیوی منافع کے لیے بنائی گئی ہو، یا جس میں کوئی دنیاوی مصلحت ہو۔ یعنی یہ ایک ایسا نظام ہے جو صرف دنیاوی فائدوں کے لیے وضع کیا گیا ہے، اور جو خالصتاً دنیاوی مصالح کو پیش نظر رکھتا ہے، اس لیے اس کا لازمی نتیجہ لادینیت یا لامذہبیت ہوتا ہے۔ ریاست کے تعلق سے سیکولرازم کا مطلب یہ ہے کہ ریاست کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے، بلکہ ریاست خالصتاً دنیاوی منافع ومصالح کے تحت چلنی چاہیے، کیونکہ مذہب انسان کا ذاتی معاملہ ہے۔ (اسلام اور سیاسی نظریات: ۸۳-۸۵)

دوسرا شخص جس کا جمہوریت کی صورت گری میں بڑا کردار ہے، مونٹیسکو (Montesquiue) ہے۔ اس کی صرف ایک کتاب مشہور ہے جس کا نام ہے روح قانون (Spirit of Law) اور یہ کتاب ہمارے کتب خانے میں موجود ہے۔ یہ ایک ہی کتاب ہے اور تقریباً چار سو صفحے کی ہے، لیکن وہ کہتا ہے کہ میں اس کتاب کو لکھ کر اتنا تھک گیا ہوں کہ اب مین ساری عمر آرام کرنا چاہتا ہوں۔ اس کی یہ کتاب اصل میں قانون اور اس کے

فلسفے پر ہے۔لیکن جمہوریت کے سلسلے میں اس کا ایک نظریہ ہے، جو تفریق اختیارات کا نظریہ کہلاتا ہے، اور جسے انگریزی میں "Separation of power" کہتے ہیں۔اس کا کہنا یہ ہے کہ جتنی مطلق العنان حکومتیں ہوئی ہیں، اوران کی مطلق العنانی سے لوگوں کو جو نقصان پہنچا ہے، اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ریاست کے تمام اختیارات کسی ایک شخص یا کسی ایک ادارے میں مرتکز تھے، جس کے نتیجے میں لوگوں پر ظلم بھی ہوتا تھا، اور ریاست کے کاموں میں ابتری بھی پیدا ہوتی تھی، لہذا اس وقت تک بہتر نتائج حاصل نہیں کیے جاسکتے، جب تک اختیارات کو مختلف جہتوں پر پھیلایا نہیں جاتا۔چنانچہ مونٹیسکو نے پہلی بار یہ بات کہی کہ ریاست کے اختیارات درحقیقت تین مختلف قسم کے اختیارات ہیں۔(۱) قانون سازی کا اختیار (۲) ملک کا انتظام اس قانون کے مطابق چلانے کا اختیار (۳) اگر کوئی شخص قانون کے خلاف کوئی کام کرے یا اس معاملے میں کوئی تنازعہ پیدا ہوجائے کہ یہ کام قانون کے دائرے میں ہے یا نہیں تو اس تنازعہ کا فیصلہ کرنے کا اختیار۔مونٹیسکو کے تفریق اختیارات کے نظریے کا مطلب یہ ہے کہ یہ تینوں اختیارات کسی ایک شخص یا ادارے میں مرتکز نہیں ہونے چاہییں، بلکہ یہ تینوں ادارے ایک دوسرے سے آزاد اور خودمختار ہونے چاہییں، اور ایک ادارے کو دوسرے ادارے کے کام میں دخل اندازی نہیں کرنی چاہیے۔

چنانچہ قانون سازی کا اختیار جس ادارے کو حاصل ہو، اس کا نام مقننہ یا لیجسلیچر (Legislature) ہے اور جمہوریت میں یہ اختیارات پارلمنٹ یا اسمبلی کو حاصل ہوتے ہیں۔قانون کے مطابق ملک کا انتظام چلانے کا اختیار جس ادارے کو حاصل ہوتا ہے، اسے انتظامیہ یا ایگزیکٹیو (Executive) کہا جاتا ہے، جس کا سربراہ صدارتی نظام میں صدر مملکت اور پارلیمانی نظام میں وزیر اعظم ہوتا ہے، تیسرا اختیار یعنی قانون کی تشریح اور تنازعات کا تصفیہ جو ادارہ کرتا ہے اسے عدلیہ یا جوڈیشری (Judiciary) کہا جاتا ہے، اور جو ملک کی عدالتوں کی شکل میں وجود میں آتا ہے۔مونٹیسکو کا کہنا یہ تھا کہ ماضی میں یہ تینوں قسم کے اختیارات ایک شخص یا ایک جہت میں مرکوز ہوتے تھے، وہی قانون بناتی تھی، وہی انتظام کرتی تھی، اور وہی تنازعات کا تصفیہ کرتی تھی۔نتیجہ اس کا یہ تھا کہ اگر انتظامیہ کوئی گڑبڑ کرے تو اس کے خلاف فریاد بھی اسی کے پاس لے جانی پڑتی تھی۔شاعر نے اسی قسم کے نظام کے بارے میں کہا تھا کہ:

وہی قاتل وہی شاہد وہی منصف ٹھہرے
اقربا میرے کریں خون کا دعویٰ کس پر؟

اگر چہ بادشاہت کے نظام میں بھی عدالتیں ہوتی تھیں، لیکن اول تو آخری فیصلہ بادشاہ ہی کا ہوتا تھا، دوسرے عدالت میں فیصلہ کرنے والے جج بادشاہ ہی متعین کرتا تھا اور ان کو معزول کرنے کا اختیار بھی اسی کو حاصل ہوتا تھا، اس لیے جج ہمیشہ بادشاہ کے چشم و ابرو کو دیکھتے تھے، اگر فیصلہ بادشاہ کی مرضی کے خلاف کر دیا تو جج کو معتوب اور معزول ہونا پڑتا تھا۔ اس طرح سارے کے سارے اختیارات ایک ہی جہت میں مرتکز ہو گئے تھے۔ اگر حاکم کوئی ظلم کرے تو دعویٰ کس کے پاس لے کر جائیں؟ اسی حاکم کے پاس، کیونکہ وہ حاکم خود ہی قاضی بھی ہے، فیصلہ کرنے والا بھی ہے، اگر اس نے کوئی قانون بنا دیا ہے، اور وہ قانون اچھا نہیں لگ رہا ہے، تو اس قانون کے خلاف کہاں فریاد لے کر جائیں؟ پھر اسی کے پاس۔ لہذا اس سے مطلق العنانی بڑھتی ہے۔ تفریق اختیارات کے نظریہ کا کہنا ہے کہ یہ تینوں اعمال حکومت کے الگ الگ اداروں کے پاس ہونے چاہئیں، اور ان میں سے ہر ایک کو مکمل طور پر خود مختار ہونا چاہیے، کوئی ادارہ دوسرے کے دباؤ میں نہ ہو۔ مقننہ قانون بنائے، اور جو قانون وہ بنا دے، انتظامیہ اس کو عملاً نافذ کرے اور عدلیہ خود مختار ہونی چاہیے، تا کہ اگر کسی کو مقننہ سے کوئی شکایت ہے یا انتظامیہ سے کوئی شکایت ہے، تو وہ عدلیہ کے پاس جائے اور عدلیہ اس کی شکایت کو رفع کرنے کی پوزیشن میں ہو۔ لہذا ریاست کو ان کے تین حصوں میں تقسیم کرنا ضروری ہے۔ اس کو تفریق اختیارات کہتے ہیں۔

اس نظریہ کو بعد میں تمام جمہوریتوں نے تسلیم کیا، اور اب کسی ریاست کے جتنے دستور بنتے ہیں وہ اسی بنیاد پر بنتے ہیں، کہ مقننہ کے الگ اختیارات ہوتے ہیں، اور انتظامیہ اور عدلیہ کے اختیارات الگ ہوتے ہیں، یہاں تک ہوتا ہے کہ جب مقننہ نے ایک مرتبہ کوئی قانون بنا دیا اور نافذ کر دیا، تو اس نظریہ کے مطابق اب مقننہ کو قانون بنانے کے بعد اس کی تشریح کا اختیار نہیں ہے۔ قانون بناتے وقت جو الفاظ اس نے استعمال کر لیے، اب وہ ایسے ہو گئے جیسے تیر کمان سے نکل گیا۔ اب ان الفاظ کی تشریح عدلیہ کرے گی کہ اس قانون کا کیا مطلب ہے۔ جس شخص نے خود اپنے قلم سے قانون لکھا تھا، وہ مقننہ سے قانون پاس کرانے کے بعد یہ کہے کہ میری فلاں لفظ سے یہ مراد تھی، تو اس کی یہ بات قابل قبول نہیں ہوگی۔ اب یہ کام عدلیہ کا ہے کہ وہ یہ دیکھے کہ جو بھی لفظ استعمال ہوا ہے، اس لفظ کے کیا معنی ہیں؟ پارلیمنٹ یہ تو کر سکتی ہے، کہ اس قانون کو منسوخ کر دے، یا نیا قانون لے آئے یا اس میں ترمیم کر دے۔ لیکن جب تک وہ قانون اسی شکل میں نافذ ہے، اس وقت تک اس کی تشریح کا اختیار عدلیہ کو ہے۔

یہاں یہ بات بھی عرض کر دوں کہ اختیارات کی اس علیحدگی کو تفریق اختیارات کہا جاتا ہے۔ ایک اور

نظریہ ہے جس کو تقسیم اختیارات کہتے ہیں وہ اور چیز ہے۔

تقسیم اختیارات (Division of Power) کا مفہوم یہ ہے کہ مرکز اور صوبوں میں اختیارات کس طرح تقسیم ہوں گے؟ کتنا اختیار مرکز کے پاس ہے؟ اور کتنا صوبوں کے پاس ہے؟ Mountisque کا جو نظریہ تفریق اختیارات ہے وہ پہلے معنی میں ہے۔

(۳) تیسرا شخص جس نے جمہوریت کی صورت گری میں حصہ لیا وہ روسو (Rousseau) ہے۔ اس کا میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں اور یہ وہی شخص ہے، جس نے معاہدہ عمرانی کے نظریہ کی تجدید کی ہے۔ معاہدہ عمرانی کا نظریہ عرض کیا جا چکا ہے۔ اس کی کتاب جو اس لحاظ سے مشہور ہے، اس کا نام بھی معاہدہ عمرانی ہے۔

روسو نے اپنی کتاب میں معاہدہ عمرانی کی نظریہ کی تجدید کی ہے۔ یہ نظریہ خاصا پرانا ہے، لیکن اس کے نتائج دو مختلف سمتوں میں نکلے ہیں۔ ایک سمت یہ تھی کہ معاہدہ عمرانی کے نتیجے میں مطلق العنان حکومت قائم ہونی چاہئے۔ روسو (Rousseau) پہلا شخص ہے، جس نے آکر یہ کہا کہ معاہدہ عمرانی کا نتیجہ یہ نہیں ہے کہ مطلق العنان حکومت قائم ہو، بلکہ معاہدہ عمرانی کا نتیجہ یہ ہے کہ ایسی حکومت قائم ہو جس میں افراد کو آزادی ہو، اور حکومت افراد کی نمائندہ ہو۔ کیونکہ انہوں نے حکومت کی حق میں اپنے ذاتی حقوق سے جو دستبرداری اختیار کی ہے، وہ اس وجہ سے اختیار کی ہے کہ یہ حکومت ہمارے مفادات اور ہماری آزادیوں کا تحفظ کرے گی۔ لہذا معاہدہ عمرانی کا تقاضا یہ ہے کہ عوام اپنی نمائندہ حکومتیں قائم کریں اور فرد کے مفادات کا تحفظ کیا جائے۔ اس طرح روسو کے نظریے میں دو چیزیں ہیں: ایک فرد کی آزادی پر زور دینا اور دوسرے افراد کی نمائندہ حکومت، یعنی افراد کو یہ حق ہونا چاہیے کہ وہ جب چاہیں کوئی حکومت بنائیں اور جب چاہیں ختم کردیں۔

یہ تین بنیادی نظریات ہیں جنہوں نے آزاد خیال اور سیکولر جمہوریت کی صورت گری کی ہے: ریاست کو مذہب سے الگ کردینا، تفریق اختیارات، اور فرد کی آزادی کے نتیجے میں نمائندہ حکومت۔

(اسلام اور سیاسی نظریات: ۸۶ تا ۸۹)

جمہوریت کے قیام میں تاریخی عوامل:

دنیا میں جمہوریت کے قیام میں دو واقعات کارفرما ہیں:

۱- امریکہ کی آزادی ۲- انقلاب فرانس

۱۷۷۶ء میں امریکہ برطانیہ سے آزاد ہوا اور اس کے بارہ تیرہ سال کے بعد ۱۷۸۹ میں فرانس میں

انقلاب رونما ہوا اور دونوں جگہوں پر جمہوری حکومتیں قائم ہوئیں، بعد میں یورپ کے باقی ملکوں لاطینی، امریکہ اور ایشیاء میں عام ہوئیں۔ (مبادی سیاسیات: ص ۱۴۸)

جمہوری ممالک

- وحدانی
  - دستوری بادشاہت
    - پارلیمانی حکومت (برطانیہ، سویڈن، ڈنمارک ہالینڈ، اسپین، جاپان نیپال)
  - ری پبلک
    - پارلیمانی حکومت صدراتی حکومت (فرانس، بنگلہ دیش، ترکی، اسرائیل)
    - صدراتی حکومت (ایران، جنوبی افریقہ، فلپائن، برازیل، زمبابوے)
- وفاقی
  - دستوری بادشاہت
    - ویلشباء کناڈا، آسٹریلیا
  - ری پبلک
    - پارلیمانی حکومت (جرمنی، سوئزلینڈ، بھارت، پاکستان)
    - صدارتی حکومت (ولایت متحدہ، روسی فیڈریشن، نائجیریا، تنزانیہ)

استبدادی ممالک

- وحدانی (چین، ویت نام، شمالی کوریا، کیوبا، عراق، شام، الجزائر، مراکش، اردن، سعودیہ، امارات متحدہ عربیہ)
- وفاقی (سابق سوویت یونین، سابق یوگوسلاویہ سابق چیکوسلواکیہ)

(مبادی سیاسیات: ص ۱۱۶)

جمہوری حکومتیں بھی مختلف اشکال کی ہوتی ہیں مندرجۂ ذیل چارٹ سے اسے جانا جاسکتا ہے۔

تنظیمی اعتبار سے جمہوری حکومت کی تین خاص شکلیں ہیں۔

۱-برطانوری طرز کی پارلمانی جمہوریت ۲-امریکی طرز کی صدارتی جمہوریت

۳-فرنچ طرز کی مخلوط صدارتی پارلیمانی حکومت

ان میں سے ہر طرز کی حکومت وحدانی اور وفاقی دونوں طرز کی مملکت سے پورا میل رکھتی ہے، مثلاً ولایاتِ متحدہ امریکہ وفاقی مملکت ہے اور یہاں صدارتی حکومت کام کرتی ہے، لیکن ہندوستان، آسٹریلیا اور کناڈا کے وفاقی ملکوں میں پارلیمانی نظام کام کرتا ہے، اسی طور پر جمہوری طرز حکومت دستوری بادشاہت کے بھی عین مطابق ہے، اس کی مثالیں برطانیہ، ہالینڈ، ڈنمارک، یونان، ملیشیا اور نیپال ہیں۔

(مبادی سیاسیات: ص ۱۱۶)

جو ادارے جمہوریت کے زیر آراء قائم ہوئے ہیں، ان میں چار ادارے خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ (Legislature)

۱-سیاسی جماعتیں ۲-انتخابات ۳-مقننہ ۴-دستور

جمہوری ملک میں انجمنیں اور جماعتیں تین قسم کی ہوئیں:

(۱) مشترک مفاد کے حصول کی انجمن Interest Group

(۲) پریشر گروپ presser Group

(۳) سیاسی جماعتیں political Group Party

انتخابات:

جمہوری ملک میں یہ ضروری ہے کہ حکومت انتخابات کے نتیجے میں برسر اقتدار آئے۔ اس غرض کے لیے شروع میں پارلیمنٹ کی رکنیت کے لیے انتخابات ہوتے ہیں، پھر جو جماعت اکثر ارکان پارلیمنٹ کی حمایت حاصل کر لے وہ حکومت بناتی ہے۔ عام جمہوریت میں انتخابات کے دو طریقے ہیں:

۱-بلاواسطہ یا براہِ راست انتخاب۔

۲-بالواسطہ انتخاب۔

بلاواسطہ انتخاب کا مطلب ہے کہ ہر ۱۸ سال یا اس سے زائد عمر کا شہری ووٹ ڈالنے کا حق رکھتا ہو۔

بالواسطہ کا مطلب ہے کہ عوام پہلے ایسے لوگوں کا انتخاب کرے، جو پارلیمنٹ کے ارکان منتخب کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں، پھر وہ منتخب افراد مقننہ کے لیے ممبران کا انتخاب کریں۔

چونکہ مضمون طول پکڑ رہا ہے، لہذا اب اس پر زیادہ کچھ نہ تحریر کرتے ہوئے مندرجۂ ذیل چارٹ کو مبادیٔ سیاست سے نقل کردیا جاتا ہے، جس سے انشاء اللہ انتخابی نظام آسانی سے سمجھ میں آجائے گا۔

انتخابی نظام کی اشکال

اکثریت پر مبنی نظام	متناسب نمائندگی کا نظام
(ا) ''سادہ اکثریت'' کا اصول یعنی ہر مرحلہ میں جو امیدوار اپنے حریفوں کے مقابلہ میں زیادہ ووٹ پائے منتخب قرار دیا جاتا ہے۔ (ب) ''قطعی اکثریت'' کا اصول یعنی انتخاب کے لیے ۵۱ فیصد یا دو تہائی یا تین چوتھائی اکثریت لازم ہوتی ہے۔ قطعی اکثریت کے نظام کی بھی دو شکلیں ہیں: (الف) ترجیح بیلٹ یعنی ووٹر امیدواروں کے ناموں کے آگے اپنی ترجیح ظاہر کرتا ہے۔ (ب) ''سیکنڈ بیلٹ'' یعنی جب کوئی امیدوار قطعی اکثریت حاصل نہ کرسکے تو سب سے زیادہ ووٹ پانے والے دو یا تین امیدواروں کے درمیان دوبارہ مقابلہ ہوتا ہے۔	(الف) ''واحد قابلِ منتقلی بیلٹ'' یعنی ہر ووٹر اپنے بیلٹ پر امیدواروں کے ناموں کے آگے اتنی ترجیحات ظاہر کرسکتا ہے جتنی نشستیں پُر کی جاتی ہیں، پھر ترجیحات کی گنتی میں جو امیدوار ووٹوں کا مطلوبہ کوٹا حاصل کرلیتے ہیں منتخب قرار دیے جاتے ہیں۔ (ب) ''پارٹی لسٹ'' یعنی ووٹر امیدواروں کے بجائے پارٹی کو ووٹ دیتا ہے، پھر ووٹوں کے تناسب سے پارٹیوں میں نشستوں کی تقسیم کی جاتی ہے، یہ نظام سوئزرلینڈ میں رائج ہے۔ (مبادیٔ سیاسیات، ص ۱۵۴)

اب اس کے بعد مقننہ (Legislature) کا تعارف پیشِ خدمت ہے۔

مقننہ (Legislature)

جمہوریت کا قائم کردہ تیسرا ادارہ "مقننہ" کہلاتا ہے۔ یہ جمہوریت کے نظام میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ "مقننہ" کے لفظی معنی ہیں "مجلس قانون ساز" یعنی قانون بنانے والی مجلس۔ اس ادارے کو "پارلیمنٹ" یا "اسمبلی" کہا جاتا ہے۔ "پارلیمنٹ" کے معنی ہیں، وہ جگہ جہاں لوگ بیٹھ کر مباحثہ کریں، اور "اسمبلی" کے معنی ہیں "اجتماع گاہ"۔ اس ادارے کا بنیادی کام قانون سازی ہے، ملک کے اندر کیا قانون نافذ ہونا چاہیے؟ اس پر یہ ادارہ بحث کرتا ہے، پھر جس قانون کو اکثریت کی حمایت حاصل ہوجائے، اُسے منظور کر کے نافذ بھی کرتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ ادارہ حکومت کی پالیسیوں پر بھی بحث کرتا ہے، اور جمہوری نظام میں اسے سب سے بالاتر ادارہ تصور کیا جاتا ہے۔

مقننہ کے دو نظام:

پھر جمہوری نظام کے اندر مقننہ کے دو قسم کے نظام مشہور ہیں:

(۱) یک ایوانی مقننہ کا نظام (Unicameral)

(۲) دو ایوانی مقننہ کا نظام (Bicameral)

یک ایوانی مقننہ کا نظام بالکل ظاہر اور واضح ہے کہ، ملک میں حکومت چلانے کے لیے ایک مقننہ وجود میں آگئی، وہی قانون سازی کرتی ہے، اور جو قانون بھی وہ منظور کردے وہ قانون ملک میں نافذ ہوجاتا ہے۔

دو ایوانی مقننہ کے نظام میں ایک ایوانِ زیریں ہوتا ہے اور ایک ایوان بالا کہلاتا ہے۔

ایوانِ زیریں:

جیسے ہمارے ملک (پاکستان) میں "قومی اسمبلی" برطانیہ میں "دارالعوام" ہندوستان میں "لوک سبھا" امریکہ میں "کانگریس"۔

ایوان بالا:

جیسے ہمارے ملک (پاکستان) میں "سینیٹ" برطانیہ میں "دارالامراء" ہندوستان میں "راجیہ سبھا" امریکہ میں "سینیٹ"۔

سوال یہ ہے کہ دو ایوانوں کی کیا ضرورت ہے؟ اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ایوان زیریں میں

نمائندے بالغ رائے دہی کی بنیاد پر اور عموماً جماعتی نظام کے تحت منتخب ہو کر آجاتے ہیں، صلاحیت کی بنیاد پر منتخب نہیں ہوتے، جس کی وجہ سے ان میں جذباتیت زیادہ ہوتی ہے، وہ اپنی سیاسی جماعت کے دباؤ کی وجہ سے مغلوب ہوتے ہیں، اور ان لوگوں سے یہ بات بعید نہیں کہ وہ جذباتیت میں آکر کوئی ایسا قانون طے کر دیں، جو ملک کے لیے فائدہ مند نہ ہو۔ لہذا ایک ایسے ادارے کی ضرورت جس کی تشکیل ایوان زیریں پاس کرے، اس قانون پر دوبارہ اس ایوان بالا میں گفتگو ہو، اور پھر غور و فکر کے بعد اس قانون کو نافذ کیا جائے، تا کہ کوئی قانون جلد بازی میں اور جذباتیت کے تحت نہ بن جائے، چنانچہ اصل تصور یہ تھا کہ جس موضوع پر قانون سازی کی جارہی ہے، اس موضوع کا کوئی ماہر بعض اوقات ایوان زیریں میں نہیں ہوتا، لہذا ایوانِ بالا میں ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے ماہرین کو لیا جائے، تا کہ جب ایوان بالا میں اس قانون پر نظر ثانی کریں، اور فنی نقطہ نظر سے اس کا جائزہ لیں، اگر اس میں ترمیم ضروری سمجھیں تو ایوان زیریں کو ترمیم کا مشورہ دیں۔

اگر ایوان بالا کی تشکیل میں واقعۃً علمی اور فنی صلاحیت کو معیار بنایا جائے، تو ایوان بالا کی ضرورت قابل فہم ہے۔ لیکن عموماً ایسا نہیں ہوتا، بلکہ بہت سے ملک ایسے ہیں، جن میں ایوان بالا کے ارکان اس بنیاد کے بجائے کسی اور معیار پر منتخب ہوتے ہیں، جس کے لیے الگ الگ طریق کار مقرر ہیں، اس لیے اس کا مذکورہ بالا فائدہ ظاہر نہیں ہوتا۔

ایوان بالا کی دوسری وجہ جواز بیان کی جاتی ہے کہ جو ملک ایک سے زائد صوبوں پر مشتمل ہیں، اور ان صوبوں میں علاقائی یا ثقافتی یا لسانی اختلافات موجود ہیں، ظاہر ہے کہ ان میں کوئی صوبہ چھوٹا ہوگا، کوئی صوبہ بڑا ہوگا، جیسے ہمارے پاکستان میں پنجاب بڑا صوبہ ہے، اور سندھ اور بلوچستان چھوٹے صوبے ہیں، اور ایوان زیریں میں آبادی کی بنیاد پر نمائندے منتخب ہو کر وہاں پہنچتے ہیں، تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چھوٹے صوبے کے نمائندہ افراد وہاں کم ہوتے ہیں، اور بڑے صوبے کے افراد زیادہ ہوتے ہیں، اس صورت میں یہ ممکن ہے کہ بڑے صوبے کے نمائندہ افراد کوئی ایسا قانون پاس کرالیں، جو چھوٹے صوبوں کے مفادات کے خلاف ہو، اور چھوٹے کے نمائندے چونکہ اقلیت میں ہوتے ہیں، اس لیے ان کی رائے مسترد ہو جائے۔ اس لیے ایک ایوان بالا ایسا ہونا چاہیے جس میں تمام صوبوں کی نمائندگی برابر ہو، آبادی کی بنیاد پر نہ ہو، تا کہ وہاں بڑے صوبے کے نمائندے اپنی من مانی نہ کر سکیں، اور اس وقت دنیا کے جن ممالک میں دو مقننہ ہیں، وہ زیادہ تر اسی نقطہ نظر کی وجہ سے ہیں، تا کہ وہاں چھوٹے صوبے کے مفادات کا تحفظ کیا جا سکے۔

عجیب بات یہ ہے کہ ایک طرف یہ کہا جاتا ہے، کہ یہ دوسرا ایوان بالا اس لیے بنایا جاتا ہے، تاکہ چھوٹے صوبوں کے مفادات کا تحفظ کیا جاسکے اور نام کے اعتبار سے وہ "ایوان بالا" ہے، لیکن یہ ایوان بالا اپنے اختیارات کے اعتبار سے بہت کمزور رہتا ہے، اور ایوان بالا ہونے کے باوجود حقیقت میں وہ ایوان زیریں سے بہت کم تر ہوتا ہے؛ چنانچہ اکثر وبیشتر ملکوں میں یہ ہوتا ہے، کہ ایوان زیریں جو قانون پاس کرا دیتا ہے، پھر وہ قانون ایوان بالا میں پیش کیا جاتا ہے، غور وفکر کے بعد ایوان بالا کے افراد اس قانون کو اگر درست نہ سمجھیں، تو وہ زیادہ سے زیادہ یہ کرسکتے ہیں کہ دوبارہ غور کرنے کے لیے ایوان زیریں کو واپس کردیں، لیکن اس قانون کو رد نہیں کرسکتے۔ چنانچہ دوبارہ غور کرنے کے بعد ایوان زیریں اسی قانون کو پاس کردے تو اب وہ قانون منظور ہو جائے گا، دوبارہ ایوان بالا میں پیش نہیں کیا جائے گا۔ (اسلام اور سیاسی نظریات: ۱۰۳تا۱۰۵)

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا، جمہوری نظام میں "مقننہ" سب سے اعلیٰ ترین ادارہ سمجھا جاتا ہے، اور جمہوریت کے مذہب میں "مقننہ" کو معصوم عن الخطا تصور کیا جاتا ہے، گویا اس سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہوسکتی، البتہ اس بارے میں امریکی اور برطانوی نظام میں فرق ہے۔ برطانوی نظام میں پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے کسی قانون کو یا اس کی کسی اقدام کو ملک کے کسی ادارے میں بھی چیلنج نہیں کیا جاسکتا، اس لیے کہ پارلیمنٹ سے غلطی سرزد نہیں ہوسکتی۔ جبکہ امریکی نظام میں "پارلیمنٹ" کوئی قانون پاس کردے اور کوئی شخص اس قانون کو دستور کے خلاف یا بنیادی حقوق کے خلاف سمجھے، تو وہ اس قانون کو عدالت میں چیلنج کرسکتا ہے، اور اگر عدالت اس قانون کو ملکی آئین یا بنیادی حقوق کے خلاف قرار دیدے، تو پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے قانون کو کالعدم کرسکتی ہے۔ اس کو عدالتی نظر ثانی (Judicial Review) کا نظام کہا جاتا ہے۔ (اسلام اور سیاسی نظریات: ۱۰۶تا۱۰۷)

دستور

جمہوریت کا چوتھا اہم جزء دستور ہے۔

جمہوری حکومت اور مطلق العنان حکومت کے درمیان یہی بنیادی فرق ہوتا ہے کہ مطلق العنان حکومت کسی دستور کی پابند نہیں ہوتی، جبکہ جمہوری نظام میں حکومت اس بات کی پابند ہے کہ وہ اپنا نظام حکومت دستور کے مطابق چلائے۔

عام طور پر لوگ "دستور" اور "قانون" میں فرق نہیں کرتے۔ "دستور" اس دستاویز کو کہا جاتا ہے، جس میں حکومت چلانے کے قواعد وضوابط درج ہوں۔ مثلاً اس میں یہ درج ہوتا ہے کہ "مقننہ" کے کیا اختیارات ہیں؟

انتظامیہ کے اختیارات کیا ہیں؟ صدر اور وزیر اعظم کے اختیارات کیا ہیں؟ انتخابات کس طرح ہوں گے؟ مقننہ ایک ایوانی ہوگی یا دو ایوانی ہوگی؟ اخراجات کرنے کا طریقہ کار کیا ہوگا؟ عدلیہ کس طرح وجود میں آئے گی، اور عدلیہ کے اختیارات کیا ہوں گے؟ یہ تمام باتیں دستور میں درج ہوتی ہیں، جبکہ قانون عوام کے لیے ہوتا ہے کہ عوام اپنے معاملات کن قوانین کے تحت انجام دیں گے۔

پھر دستور دو طرح کے ہوتے ہیں:

(۱) وحدانی دستور (۲) وفاقی دستور

وحدانی دستور (Unitary)

وحدانی دستور کا مطلب یہ ہے کہ پورے ملک کے لیے ایک ''مقننہ'' ہوگی اور اس کی جو علاقائی وحدتیں ہیں، چاہے وہ صوبوں کی شکل میں ہوں یا ضلعوں کی شکل میں، یا ریاستوں کی شکل میں ہوں، ان وحدتوں کی کوئی علیحدہ حکومت اور مقننہ نہیں ہوتی، بلکہ پورے ملک کی ایک ہی حکومت، ایک ہی مقننہ ایک ہی انتظامیہ، ایک ہی عدلیہ ہوتی ہے، اور پورے ملک کا نظام مرکز سے چلتا ہے، اور تمام علاقے اسی حکومت کے ماتحت ہوتے ہیں، اور انتظامی وحدتوں مثلاً صوبوں، ضلعوں اور ریاستوں وغیرہ کے انتظام چلانے کے لیے سرکاری ملازمین کو مقرر کیا جاتا ہے۔ جیسے شہر کے انتظام کے لیے ''کمشنر یا ڈپٹی کمشنر'' ہوتا ہے، وہ شہر کا حاکم تصور کیا جاتا ہے، وہ سیاسی حکمران نہیں ہوتا، بلکہ سرکاری ملازم ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر کئی صوبے ہیں، تو ہر صوبے میں سرکاری ملازم وہاں کا نظام چلاتا ہے۔ لیکن نہ اس کی علیحدہ اسمبلی ہوتی ہے، اور نہ کوئی کابینہ، اور نہ اس کا علیحدہ کوئی سیاسی وجود ہوتا ہے۔ یہ وحدانی دستور کا طریقہ کار ہے۔ عام طور پر یہ نظام ان ممالک میں جاری کیا جاتا ہے، جہاں صوبے زیادہ نہ ہوں، یا جس ملک کے تمام لوگ ایک ہی نظریئے کے حامل ہوں۔ چونکہ ان میں آپس کے مفادات کا ٹکراؤ نہیں ہوتا، اس لیے وہاں وحدانی دستور اختیار کیا جاتا ہے۔

برطانیہ میں ''وحدانی نظام حکومت'' ہے، حالانکہ مختلف علاقائی وحدتیں موجود ہیں، اور مختلف علاقوں کی ثقافت میں، زبان کے لہجوں میں اور طریقہ زندگی میں بھی فرق ہے، لیکن وہ لوگ چونکہ اپنے آپ کو ایک نظام فکر کا پابند سمجھتے ہیں، اس لیے انہوں نے اپنے ملک میں ''وحدانی'' دستور کا طریقہ اختیار کیا ہوا ہے۔

وفاقی دستور

وفاقی دستور وہاں نافذ ہوتا ہے، جہاں ایک ملک میں متعدد علاقائی وحدتیں موجود ہوں۔ وفاقی

حکومت کا اصل تصور تو اس طرح پیدا ہوا تھا کہ شروع میں ہر علاقائی وحدت کی اپنی الگ حکومت تھی۔ دوسرے الفاظ میں ہر صوبہ ایک مستقل ملک کی حیثیت رکھتا تھا، لیکن بعد میں ان حکومتوں نے مل کر ایک اتحاد قائم کر لیا جو وفاق کہلایا۔ اس طرح ایک مرکزی حکومت ہوگئی جو وفاقی حکومت کہلائی، اور ہر صوبے کی ایک ذیلی حکومت الگ قائم رہی، اور انہوں نے اپنے درمیان اختیارات تقسیم کر لیے۔

لیکن عملاً وفاقی دستور یا وفاقی نظام اس جگہ پر بھی جاری کر دیا گیا، جہاں شروع ہی سے ایک بڑی حکومت وجود میں آئی اور اس میں صوبوں کی شکل میں چھوٹی چھوٹی علاقائی وحدتیں تھیں، تو ان کو مطمئن کرنے کے لیے بجائے وحدانی طرزِ حکومت کے وفاقی طرزِ حکومت اختیار کیا گیا، تا کہ ہر صوبہ یہ محسوس کرے کہ ہماری اپنی ایک آواز ہے، اور ہمارا اپنا ایک تشخص ہے۔ اس طرز میں یہ ہوتا ہے کہ ایک وفاقی حکومت ہوتی ہے، جسے مرکزی حکومت کہا جائے، اور دوسرے ہر صوبے کی اپنی صوبائی حکومت ہوتی ہے، جیسے کہ ہمارے پاکستان میں ہے کہ ہمارے یہاں ایک وفاقی حکومت ہے، اور ہر صوبے کی حکومتیں الگ ہیں۔ پنجاب کی حکومت الگ، سندھ کی حکومت الگ، بلوچستان کی حکومت الگ، اور سرحد کی حکومت الگ ہے۔ یہ صوبائی حکومتیں ہوتی ہیں، اور دستور میں یہ بات طے ہوتی ہے کہ کن معاملات میں قانون سازی کا حق وفاق کو ہے، اور کن معاملات میں قانون سازی کا حق صوبوں کو ہے۔ اس غرض کے لیے بعض اوقات دستور میں قانون سازی کے اختیارات وفاق اور صوبوں میں تقسیم کرنے کے لیے قانون سازی کے معاملات کی الگ الگ فہرستیں بنادی جاتی ہیں کہ، ان معاملات میں قانون سازی وفاق کرے گا، ان معاملات میں صوبے کریں گے، اور یہ معاملات ایسے ہیں جن میں دونوں قانون سازی کر سکتے ہیں۔ ہمارے ہاں پاکستان کے دستور میں دو فہرستیں ہیں۔ ایک وفاقی اور دوسری مشترک فہرست۔ یعنی وفاقی فہرست میں وہ امور درج ہوتے ہیں، جن میں قانون سازی صرف وفاق کر سکتا ہے، اور مشترک فہرست میں وہ امور درج ہوتے ہیں، جن میں وفاق اور صوبہ دونوں قانون سازی کر سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ جتنے امور ہیں، ان سب میں قانون سازی کے اختیارات تمام تر صوبوں کے پاس ہیں۔ اب جن صوبوں کی طرف سے صوبائی خود مختاری کا مطالبہ ہو رہا ہے، ان کا مطالبہ یہ ہے کہ یہ مشترک فہرست ختم کر دی جائے، اور ان معاملات میں بھی قانون سازی کا مکمل اختیار صوبوں کو دے دیا جائے، اس میں وفاق کو کوئی اختیار نہ ہو۔

(اسلام اور سیاسی نظریات: ۱۰۸ تا ۱۱۱)

جمہوریت کے بارے میں عمومی معلومات کے بعد ہندوستان کا نظام جمہوریت کیا ہے؟ اس سے

متعلق معلومات پیش خدمت ہے۔

ہندوستان کا نظامِ حکومت

ہندوستان کی مرکزی حکومت کی تین شاخیں یہ ہیں: (۱) عاملہ (۲) پارلیمان اور (۳) سپریم کورٹ (عدالتِ عظمیٰ)

(۱) مرکزی عاملہ: ہندوستان کی مرکزی عاملہ صدر جمہوریہ، نائب صدر جمہوریہ اور وزیر اعظم کے زیر قیادت مجلس وزراء سے مرکب ہے، صدر جمہوریہ بالواسطہ طور سے پانچ سال کی مستقل میعاد کے لیے چنا گیا دستوری سربراہ مملکت (Head of State) ہے۔ اپنے دستوری اختیارات کے استعمال میں وہ وزارتی مشورہ اور قوانین کا پابند ہے، اصل سربراہِ حکومت وزیرِ اعظم ہے، جو کابینہ کی سربراہی کرتا ہے اور کابینہ اجتماعی طور سے لوک سبھا کے سامنے مسئول ہے۔ صدر جمہوریہ ایک انتخابی کلیہ (الیکٹورل کالج) کے ذریعہ پانچ سال کی مستقل میعاد کے لیے چنا جاتا ہے، اس کالج میں پارلیمان کے دونوں ایوانوں کے منتخب ارکان اور ریاستی قانون ساز اسمبلیوں کے منتخب ارکان شامل ہوتے ہیں، صدر کے نیچے ایک نائب صدر پانچ سال کی میعاد کے لیے پارلیمان کے دونوں ایوانوں کے ذریعہ چنا جاتا ہے، نائب صدر اپنے عہدہ کے اعتبار سے راجیہ سبھا کے اجلاس کی صدارت کرتا ہے، لیکن جب کسی وجہ سے صدر کا عہدہ خالی ہوجائے، تو نائب صدر قائم مقام (ایکٹنگ) صدر کی حیثیت سے کام کرتا ہے، اور راجیہ سبھا کی صدارت نہیں کرتا۔

ہر پارلیمانی چناؤ کے بعد لوک سبھا میں، جس پارٹی یا پارٹیوں کے اتحاد کو نشستوں کی اکثریت ملتی ہے اُس کے لیڈر کو صدر جمہوریہ وزیر اعظم کے منصب کا حلف دلاتے ہیں۔

پھر وزیر اعظم اپنی وزارت کے ارکان کی فہرست صدر جمہوریہ کی منظوری کے لیے پیش کرتا ہے، صدر کے سامنے ان وزراء کی حلف برداری کے بعد حکومت کی تشکیل مکمل ہوجاتی ہے، وزیر اعظم سربراہِ کابینہ اور سربراہِ حکومت ہے، اس کی قیادت میں کابینہ اور پوری وزارت لوک سبھا کے سامنے اجتماعی طور سے مسئول ہے، مجلس وزراء (Council of Ministers) ایک بڑی جماعت ہے، جو کابینی درجہ کے وزراء، وزرائے مملکت اور نائب وزراء سے مرکب ہے، اسی جماعت کے اندر کابینہ وہ ہیئت ہے، جس کا وظیفہ حکومت کی پالیسی بنانا، حکومت کے تمام اداروں کی کارروائیوں میں تال میل کرنا اور اعلیٰ ترین سطح سے پوری انتظامیہ کو کنٹرول کرنا

ہے، کابینہ میں فقط پورے درجہ کے وزراء اور چند وزرائے مملکت شامل کیے جاتے ہیں، باقی اربابِ حکومت کابینہ کے اجلاس میں شرکت کا حق نہیں رکھتے؛ لیکن حسبِ ضرورت انہیں خصوصی دعوت پر کابینہ کے اجلاس میں طلب کیا جاسکتا ہے، کابینہ کے وزراء کے درمیان قلمدانوں کی تقسیم وزیر اعظم کی سفارش پر صدر جمہوریہ کے ذریعہ کی جاتی ہے، ہر وزیر اپنے سررشتہ کی پالیسی اور کارکردگی کے لیے کابینہ اور لوک سبھا کے سامنے جواب دہ ہے۔

صدر جمہوریہ کسی ایسے شخص کو جو سپریم کورٹ کے جج کے عہدہ پر نصب ہونے کی اہلیت، رکھتا ہو، ہندوستان کا اٹارنی جنرل (Attorney General) مقرر کرسکتے ہیں۔ لیکن برطانیہ کے اٹارنی جنرل کے برعکس ہندوستان کا اٹارنی جنرل کابینہ کا رکن نہیں ہوتا، اس کا کام قانونی مسائل میں حکومتِ ہند کو قانونی مشورہ دینا اور معمولی فرائضِ منصبی کو ادا کرنا ہے، اس عہدہ دار کی میعاد صدر کی پسند پر منحصر ہے، عموماً حکومت کے بدلتے ہی وہ استعفیٰ دے دیتا ہے۔

(۲) پارلیمان: پارلیمان قانون ساز ادارہ ہے اور صدر جمہوریہ، راجیہ سبھا اور لوک سبھا سے مرکب ہے، راجیہ سبھا ریاستوں کی نمائندگی کرتی ہے، اس کے ارکان کی تعداد ۲۵۰ مقرر ہے، ان میں سے ۱۲ کو صدر جمہوریہ (حکومت کی سفارش پر) ادبیات، علوم، فنونِ لطیفہ اور سماجی خدمات کے میدانوں میں ممتاز لوگوں کی نمائندگی دینے کے لیے نامزد کرتے ہیں، باقی ۲۳۸ نشستیں ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں کے نمائندوں سے پُر کی جاتی ہیں۔ راجیہ سبھا میں ریاستوں اور مرکزی علاقوں کو ان کی آبادی کی نسبت سے نشستیں الاٹ کی جاتی ہیں۔ اس کی تفصیل دستورِ ہند کے چوتھے شیڈول میں درج ہے، ریاستوں کے نمائندوں کو ریاستی اسمبلی کے منتخب ارکان متناسب نمائندگی (Proportional Representation) کی بنیاد پر واحد قابلِ منتقلی ووٹ کے ذریعہ چھ سال کے لیے منتخب کرتے ہیں، مرکزی علاقوں کے نمائندوں کا چناؤ پارلیمان کے پاس کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔

راجیہ سبھا ایوانِ بالا کہلاتا ہے اور یہ ایک ناقابلِ تحلیل اور مستقل و مسلسل ایوان ہے، جب صدر جمہوریہ اپنے فرمان کے ذریعہ لوک سبھا کو تحلیل کردیتے ہیں، تو راجیہ سبھا تحلیل نہیں ہوتی، بلکہ محض آئندہ اجلاس تک کے لیے برخاست ہوجاتی ہے، راجیہ سبھا کے ارکان فرداً فرداً چھ سال کی میعاد کے لیے چنے جاتے ہیں،

لیکن ہر دوسرے سال ایک تہائی ارکان اپنی چھ سالہ میعاد پوری ہونے پر ریٹائر ہوجاتے ہیں اور ان کی جگہ نئے ارکان کا چناؤ ہوتا ہے۔ اس طرح راجیہ سبھا کی تجدید ہوتی رہتی ہے۔ راجیہ سبھا کے اجلاس کی صدارت نائب صدر ہند باعتبار عہدہ کرتا ہے۔ اس کی غیر موجودگی میں ایوان کے ذریعہ ایوان کی میعاد کے لیے چنا گیا ڈپٹی چیئرمین اجلاس کی صدارت کرتا ہے۔

لوک سبھا ایوان زیریں کہلاتا ہے اور عوام کا نمائندہ ہے۔ اسی کی اکثریت سے حکومت تشکیل ہوتی اور اسی کی اکثریت کے بل پر حکومت قائم رہتی ہے۔ لوک سبھا کی موجودہ تعداد ۵۴۷ مقرر ہے۔ ان میں سے ۵۲۷ ارکان ریاستوں کے پارلیمانی حلقوں سے عوام کے راست ووٹ سے چنے جاتے ہیں۔ ۲۰ ارکان مرکز کے زیر انتظام علاقوں سے چنے جاتے ہیں۔ صدر جمہوریہ اپنی صواب دید سے دو اشخاص کو اینگلو انڈین فرقہ کی نمائندگی کے لیے نامزد کرسکتے ہیں۔ لوک سبھا کے میعاد اپنے چناؤ کے بعد سے پانچ سال مقرر ہے۔ لیکن جاریہ میعاد کے دوران وزیر اعظم اپنی صواب دید سے کسی بھی وقت ایوان کو تحلیل کرا کے نئے چناؤ کراسکتا ہے۔ ہر الیکشن کے بعد جب لوک سبھا مجتمع ہوتی ہے، تو ارکان اپنے میں سے ایک شخص کو اسپیکر اور ایک کو ڈپٹی اسپیکر منتخب کرتے ہیں۔ اسپیکر کا وظیفہ آزادی و غیر جانب داری سے ایوان کے اجلاس کی صدارت کرنا اور نظم وضبط قائم رکھنا ہے۔

پارلیمان ہند کے چند اہم وظائف اور اختیارات یہ ہیں:

(۱) سرکاری مسودہائے قانون اور قراردادوں کی چھان بین کرنا، ان پر مباحثہ کرنا اور ان کی تصویب کرنا۔

(۲) سرکاری بجٹ کی چھان بین کرنا اور سرکاری مطالبات زر اور تجاویز مالیہ کاری کی تصویب کرنا۔

(۳) عوامی اہمیت کے مسائل کو اُٹھانا، ان پر مباحثہ کرنا اور حکومت پر مناسب کارروائی کے لیے دباؤ ڈالنا۔

(۴) عوامی شکایات کا اظہار کرنا، اور سرکار سے اُن کا ازالہ کرانا۔

(۵) اور مواخذہ کی کارروائی کے ذریعہ صدر جمہوریہ سپریم کورٹ، ہائی کورٹ مرکزی الیکشن کمشنر اور کنٹرول جنرل کو معزول کرنا۔

سرکار کو کنٹرول کرنے اور بجٹ اور مالی قوانین کو پاس کرنے کا اختیار فقط لوک سبھا کو ہے، حکومت لوک

سبھا کے سامنے ذمہ دار ہے، راجیہ سبھا کے سامنے نہیں، راجیہ سبھا میں شکست کا حکومت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، دوسری طرف نہ کوئی مالی بل کو راجیہ سبھا میں پیش کیا جاسکتا ہے، نہ لوک سبھا کے پاس کردہ کسی مالی بل کو راجیہ سبھا رد کرسکتی ہے۔عام بلوں پر اگر دو ایوانوں کے درمیان اختلاف ہو، تو اس کا تصفیہ کرانے کے لیے صدر جمہوریہ دونوں کا مشترک اجلاس طلب کرتے ہیں، جس میں سادہ اکثریت سے متنازعہ بل منظور یا نا منظور ہوتا ہے۔

دوسری طرف راجیہ سبھا کو دو خصوصی اختیارات دیے گئے ہیں، جو لوک سبھا کو نہیں حاصل ہیں: (۱) راجیہ سبھا اپنی قرارداد پاس کرکے نئی آل انڈیا سروسوں کی تشکیل کی سفارش کرسکتی ہے۔اور (۲) اگر قومی مفاد میں ضروری ہو تو راجیہ سبھا اپنی قرارداد سے پارلیمان کو مجاز کرسکتی ہے کہ وہ ریاستی فہرست کے کسی بھی موضوع پر قانون بنا سکتی ہے، اس قانون کی مدتِ اطلاق ایک سال ہے، لیکن راجیہ سبھا اپنی تجدیدی قرارداد کے ذریعہ سال بہ سال اسے جاری رکھ سکتی ہے۔

(۳) سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ: وفاقی ملکوں کی طرح ہندوستان میں وفاقی اور ریاستی عدالتوں کا دوہرا انتظام نہیں، بلکہ ایک وحدانی نظام کرتا ہے جس کی سربراہی ہندوستان کی سپریم کورٹ کرتی ہے، سپریم کورٹ سے نیچے ہائی کورٹیں ہیں اور ہائی کورٹوں سے نیچے ضلعی اور مقامی عدالتیں ہیں۔

سپریم کورٹ اس وقت ایک چیف جسٹس اور ۲۵ دوسرے ججوں پر مشتمل ہے، ان سب کی تعیین صدر جمہوریہ ضروری صلاح ومشورہ کے بعد کرتے ہیں، ان کی میعادِ ملازمت ۶۵ سال تک پہنچنے تک ہے، سپریم کورٹ کا جج نصب ہونے کے لیے متعلقہ شخص کو لازم ہے کہ ہندوستان کا شہری ہو، اور کم از کم پانچ سال تک ایک یا ایک سے زیادہ ہائی کورٹوں میں متواتر جج کی حیثیت سے کام کرنے کا تجربہ رکھتا ہو، یا کم از کم دس سال تک متواتر ایک یا ایک سے زیادہ ہائی کورٹوں میں ایڈوکیٹ کی حیثیت سے پریکٹس کرچکا ہو، یا صدر جمہوریہ کی رائے میں ممتاز ماہر قانون ہو، کسی بھی جج کو فقط پارلیمان مواخذہ کی کارروائی سے معزول کرسکتی ہے۔سپریم کورٹ کی پائیگاہ نئی دہلی میں ہے اور ہائی کورٹوں کی سیٹ ریاستوں کے مختلف شہروں میں ہے، سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے ججوں کی تنخواہیں دستور کے ذریعہ متعین ہیں اور پارلیمان اپنے ووٹ سے ان میں رد وبدل نہیں کرسکتی۔

سپریم کورٹ کی عملداری چار طرح کے معاملات کو محیط ہے:

(۱) ابتدائی عملداری (Original jurisdiction) یعنی مرکز اور ریاستوں کے مابین اور ریاستوں کے مابین مقدمات کی سماعت، بشرطیکہ ان میں کوئی ایسا قانونی نکتہ غور طلب ہو، جس پر کسی فریق

کے قانونی حق کا انحصار ہو۔

(۲) دفعہ ۳۲ کے تحت بنیادی حقوق کی حفاظت اور بحالی کا کام۔

(۳) مرافعتی عملداری (Appellate jurisdiction) ہائی کورٹوں، سنٹرل ایڈمنسٹریٹو ٹرائی بیونل، الیکشن کمیشن، کمپنی لا بورڈ اور انکم ٹیکس ٹرائی بیونل کے فیصلوں کے خلاف اپیلوں کی سماعت۔ اور

(۴) مشیرانہ عملداری (Advisory jurisdiction) اگر صدر جمہوریہ مرکزی حکومت کو درپیش کسی قانونی مسئلہ یا کسی قانونی نکتہ پر سپریم کورٹ کی رائے طلب کریں، تو انہیں اپنا قانونی مشورہ یا رائے پیش کرنا۔

ریاستوں میں اس وقت ۱۸ ہائی کورٹیں قائم ہیں، ان میں سے تین ہائی کورٹیں ایک سے زیادہ ریاستوں کے لیے کام کرتی ہیں، ہر ہائی کورٹ کی سربراہی ایک چیف جسٹس کرتا ہے، چیف جسٹس اور دوسرے ججوں کو صدر جمہوریہ ضروری صلاح و مشورہ کے بعد نصب کرتے ہیں، ہائی کورٹوں کے ججوں کی تعداد دستور سے متعین نہیں ہے، بلکہ اُسے صدر جمہوریہ کی صواب دید پر چھوڑا گیا ہے، ان کے عہدہ کی میعاد ۶۲ سال کی عمر کو پہنچنے تک ہے، ملک میں ہائی کورٹوں کے ججوں کی موجودہ تعداد ۴۹۵ ہے، ہر ہائی کورٹ اپنی علاقائی حدود میں واقع تمام عدالتوں کی کارکردگی کی نگرانی کرتی ہے۔

ہائی کورٹوں کی عملداری بھی ابتدائی اور مرافعتی نوعیت کی ہے، ابتدائی عملداری دفعہ ۲۲۶ کے تحت ہے، اور دیوانی و فوجداری معاملات میں زیریں عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف اپیلوں کی سماعت کرتی ہیں، قانون نمائندگی عوام (Representaion of people Act) کے تحت انتخابی عرض داشتوں کی سماعت کا کام بھی انہیں کا ہے۔ (مبادی سیاسیات: ص ۳۶۸ تا ۳۷۳)

یہ ہوا ہندوستان کے جمہوری نظام کے مختصر احوال اس سے معلوم ہوا کہ آنے والے انتخابات بڑی اہمیت کے حامل ہیں، کیونکہ یہ لوک سبھا انتخابات ہیں جس میں عوام اپنے ووٹ کے ذریعے اگلے پانچ سال کے لیے کونسی پارٹی حکومت کرے گی اس کا انتخاب کرے گی، لہذا تمام مسلمان اس میں پورے پورے طور پر حصہ لیں، تاکہ ایسے امیدواروں کو حکمرانی کے لیے منتخب کیا جائے جو فرقہ پرست ذہنیت نہ رکھتے ہوں۔

اسلام اور جمہوریت :

یہ ہوا جمہوریت کا مختصر تعارف اب چونکہ ہم مسلمان ہیں اور مسلمان ہمیشہ شریعت اسلامیہ کا پیروکار

ہوتا ہے، لہذا ہمارے لیے یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ اسلام جمہوریت کے بارے میں کیا کہتا ہے۔

شیخ الاسلام فقیہ العصر حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی (ادام اللہ ظلہ علینا و اطال اللہ فی عمرہ بالعافیۃ و السلامۃ و خدمۃ الاسلام و المسلمین) تحریر فرماتے ہیں:

قرونِ وسطی میں یورپ کے اندر جو شخصی حکومتیں عام طور سے رائج رہی ہیں، وہ مطلق العنان بادشاہتیں تھیں، جن میں بادشاہ کی زبان قانون کی حیثیت رکھتی تھی اور اس پر کوئی قانونی قدغن عائد نہیں ہوتی تھی، اس مطلق العنان حکمرانی کے نتیجے میں ظلم وستم اور نا انصافیوں کا بازار گرم رہا، اس لیے اس کے خلاف یورپ میں شدید ردعمل ہوا۔ "شخصی حکومت" کو بذات خود نہایت معیوب سمجھا جانے لگا اور اس کی جگہ "جمہوریت" کو ایک مثالی طرزِ حکومت کے طور پر پیش کیا گیا، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ شخصی حکومتیں ختم ہوگئیں، اور ان کی جگہ جمہوری نظام حکومت وجود میں آیا، بیشتر ملکوں میں جمہوریت قائم کی گئی، یہاں تک کہ جمہوریت کو ایک ایسا فیشن ایبل نظام حکومت سمجھا جانے لگا جو سیاست میں عدل وانصاف اور حق وصداقت کا ضامن ہے۔ چنانچہ گزشتہ (ہجری) صدی سے لیکر اب تک جتنی سیاسی تحریکیں اٹھی ہیں، ان کے ذہن میں "جمہوریت" کی حیثیت معاذ اللہ ایک ایسے "کلمہ طیبہ" کی ہوگئی ہے، جس کے بغیر آج کے دور میں سیاست کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا، دنیا بھر میں چھائے ہوئے اس پروپیگنڈے کا نتیجہ یہ ہوا کہ عہد حاضر میں جو سیاسی جماعتیں اسلام کا نام لے کر اٹھی ہیں، ان کی اکثریت بھی نہ صرف یہ کہ جمہوریت کو ایک مسلم اصول قرار دے کر آگے بڑھی ہے، بلکہ انہوں نے بھی اپنے مقاصد میں جمہوریت کے قیام کو سرفہرست رکھا ہے اور خود اپنی جماعت کو بھی جمہوری ڈھانچے پر تعمیر کیا ہے۔ چنانچہ اسی ضمن میں یہ دعوے بھی بکثرت کئے گئے ہیں کہ جمہوریت اسلام کے عین مطابق ہے، بلکہ اسلام نے جمہوریت ہی کی تعلیم دی ہے، کسی نے بہت احتیاط کی تو یہ کہہ دیا کہ جمہوریت کے جو اجزاء اسلام کے خلاف ہیں، ہم ان کے قائل نہیں ہیں، لہذا ہماری جمہوریت "اسلامی جمہوریت" ہے۔

یہ تصورات ہمارے دور میں اس قدر مشہور ہوگئے ہیں کہ ان کے خلاف کچھ سوچنا کہنا، دنیا بھر کی لعنت وملامت کو اپنے سر لینے کے مترادف ہے، اور اگر ایسے ماحول میں کوئی شخص جمہوری حکومت کے بجائے شخصی حکومت کی حمایت کرے، تو ایسا شخص تو آج کی سیاسی فضا میں تقریباً کلمہ کفر کہنے کا مرتکب سمجھا جانے لگا ہے۔

لیکن جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین اور خالص دین کی دعوت وتجدید کے لیے منتخب فرمایا ہو، وہ

زمانے پر چھائے ہوئے تصورات اور خوشنما نعروں سے مرعوب و متاثر نہیں ہوتا، بلکہ ہر حال میں حق کو حق اور باطل کو باطل قرار دیتا ہے۔ چنانچہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ نے کبھی ایک لمحے کے لیے بھی یہ تسلیم نہیں فرمایا کہ اسلام نے جمہوریت کی تعلیم دی ہے یا جمہوریت اسلام کے عین مطابق ہے۔ اس کے بجائے انہوں نے اپنے متعدد مواعظ و ملفوظات اور تصانیف میں جمہوریت پر نہایت جاندار تنقید یں کی ہیں، اور اپنے دینی نقطۂ نظر سے اس کی خرابیوں کو واضح فرمایا ہے۔

عام طور سے جمہوریت کے متعلق لوگوں کے ذہنوں میں صرف اتنا خیال رہا کہ مطلق العنان بادشاہت کے مقابلے میں یہ نظام عوام کو آزادی اظہار رائے عطا کرتا ہے اور حکمرانوں پر ایسی پابندیاں عائد کرتا ہے، جن کے ذریعے وہ بے مہار نہ ہوسکیں، اور چونکہ اسلام نے ''مشاورت'' کا حکم دیا ہے، اس لیے ''جمہوریت'' کو ''مشاورت'' کے ہم معنی سمجھ کر لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا جمہوریت عین اسلام ہے۔ حالانکہ بات اتنی سادہ نہیں ہے، درحقیقت ''جمہوری نظام حکومت'' کے پیچھے ایک مستقل فلسفہ ہے، جو دین کے ساتھ ایک قدم بھی نہیں چل سکتا، اور جس کے لیے سیکولرزم پر ایمان لانا تقریباً لازمی شرط کی حیثیت رکھتا ہے۔

جمہوریت کی حقیقت واضح کرنے کے لیے یہ جملہ مشہور ہے کہ

It is the government of the people by the people for the people

''جمہوریت عوام کی حکومت کا نام ہے جو عوام کے ذریعے اور عوام کے فائدے کے لیے قائم ہوتی ہے''۔

لہٰذا ''جمہوریت'' کا سب سے پہلا رکن اعظم یہ ہے کہ اس میں عوام کو حاکم اعلیٰ تصور کیا جاتا ہے، اور عوام کا ہر فیصلہ جو کثرت رائے کی بنیاد پر ہوا ہو وہ واجب التعمیل اور ناقابل تنسیخ سمجھا جاتا ہے۔ کثرت رائے کے اس فیصلہ پر کوئی قدغن اور کوئی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی، اگر دستور حکومت عوامی نمائندوں کے اختیار قانون سازی پر کوئی پابندی بھی عائد کردے۔ (مثلاً یہ کہ وہ کوئی قانون قرآن وسنت کے یا بنیادی حقوق کے خلاف نہیں بنائے گی) تو یہ پابندی اس لیے واجب التعمیل نہیں ہوتی کہ یہ عوام سے بالاتر کسی اتھارٹی نے عائد کی ہے یا یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے جسے ہر حال میں ماننا ضروری ہے، بلکہ صرف اس لیے واجب التعمیل سمجھی جاتی ہے کہ یہ پابندی خود کثرت رائے نے عائد کی ہے۔ لہٰذا اگر کثرت رائے کسی وقت چاہے تو اسے منسوخ بھی کرسکتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ جمہوریت نے کثرتِ رائے کو (معاذ اللہ) خدائی کا مقام دیا ہوا ہے کہ، اس کا کوئی فیصلہ رد نہیں کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اسی بنیاد پر مغربی ممالک میں بد سے بدتر قوانین کثرت رائے کے زور پر مسلسل نافذ

کئے جاتے رہے ہیں، اور آج تک نافذ کئے جارہے ہیں، زنا جیسی بدکاری سے لیکر ہم جنس جیسے گھناؤنے عمل تک کو اسی بنیاد پر سند جواز عطا کی گئی ہے اور اس طرز فکر نے دنیا کو اخلاق تباہی کے آخری سرے تک پہنچا دیا ہے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ نے کثرتِ رائے کے اس جمہوری فلسفہ پر جابجا تبصرے فرما کر اس کی کمزوری کو واضح کیا ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

وان تطع اکثر من في الارض یضلوک عن سبیل اللّٰہ

ترجمہ: اور اگر آپ زمین والوں کی اکثریت کی اطاعت کریں گے، تو وہ آپ کو اللہ کے راستے سے گمراہ کردیں گے۔

کثرت رائے کو معیارِ حق قرار دینے کے خلاف اس سے زیادہ واشگاف اعلان اور کیا ہوسکتا ہے۔ لیکن زمانہ پر چھائے ہوئے نظریات سے مرعوب ہو کر مسلمانوں میں بھی یہ خیال تقویت پا گیا ہے، جس طرف کثرتِ رائے ہوگی وہ بات ضرور حق ہوگی۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ نے اپنی تالیفات اور مواعظ وملفوظات میں بہت سے مقامات پر اس پھیلی ہوئی غلطی کی تردید فرمائی ہے، ایک وعظ میں فرماتے ہیں "آج کل یہ عجیب مسئلہ نکلا ہے کہ جس طرف کثرت رائے ہو وہ بات حق ہوتی ہے۔ صاحبو! یہ ایک حد تک صحیح ہے مگر یہ بھی معلوم ہے کہ رائے سے کس کی رائے مراد ہے۔ کیا ان عوام کالانعام کی؟ اگر انہیں کی رائے مراد ہے، تو کیا وجہ کہ حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کی رائے پر عمل نہیں کیا، ساری قوم ایک طرف رہی اور حضرت ہود علیہ السلام ایک طرف۔ آخر کیوں انہوں نے توحید کو چھوڑ کر بت پرستی اختیار نہ کی؟ کیوں تفریق قوم کا الزام سر لیا؟ اسی لئے کہ وہ قوم بہت جاہل تھی اس کی رائے جاہلانہ رائے تھی"۔

(فضائل العلم والخشیۃ ۔ معارف حکیم الامت ۲۸۷)

مطلب یہ ہے کہ عوام کی کثرت رائے کبھی معیارِ حق نہیں ہوسکتی، کیونکہ عوام میں اکثریت عموماً بے علم یا کم علم لوگوں کی ہوتی ہے۔ حضرت حکیم الامتؒ ایک موقع پر ارشاد فرماتے ہیں:۔

"مولانا محمد حسین الہ آبادی نے سید احمد خان سے کہا تھا کہ، آپ لوگ جو کثرت رائے پر فیصلہ کرتے ہیں اس کا حاصل یہ ہے کہ حماقت کی رائے پر فیصلہ کرتے ہو، کیونکہ قانون فطرت یہ ہے کہ دنیا میں عقلاء کم ہیں اور بے وقوف زیادہ، تو اس قاعدے کی بناء پر کثرت رائے کا فیصلہ بیوقوفی کا فیصلہ ہوگا"۔

(تقلیل الاختلاط مع الانام ومعارف حکیم الامت رحمہ اللہ علیہ ۶۲۶)

ایک اور موقع پر ارشاد فرماتے ہیں:

(غزوہ احد) میں ان پچاس آدمیوں میں جو پہاڑ کی گھاٹی پر متعین تھے، اختلاف ہوا بعض نے کہا کہ ہمارے بھائیوں کو فتح حاصل ہوگئی ہے، اب ہم کو گھاٹی پر رہنے کی ضرورت نہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس غرض کے لیے ہم کو یہاں متعین کیا تھا وہ غرض حاصل ہو چکی ہے، اس لیے حکم قرار بھی ختم ہوگیا۔ اب یہاں سے ہٹنے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصود کی مخالفت نہ ہوگی اور ہم نے اب تک جنگ میں حصہ نہیں لیا تو کچھ ہم کو بھی کرنا چاہیے، ہمارے بھائی کفار کا تعاقب کر رہے ہیں، ہم کو مال غنیمت جمع کر لینا چاہیے، بعض نے اس رائے کی مخالفت کی اور کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف فرما دیا تھا کہ بدون میری اجازت کے یہاں سے نہ ہٹنا، اس لیے ہم کو بدون آپ کی اجازت کی ہرگز نہ ہٹنا چاہیے، مگر پہلی رائے والوں نے نہ مانا اور چالیس آدمی گھاٹی سے ہٹ کر مال غنیمت جمع کرنے میں مشغول ہوگئے، یہ ان سے اجتہادی غلطی ہوئی، اور گھاٹی پر صرف دس آدمی اور ان کے ایک افسر رہ گئے (اس واقعہ میں کثرت رائے غلطی پر تھی اور قلت رائے صواب پر تھی، جو لوگ کثرت رائے کو علامتِ حق سمجھتے ہیں، وہ اس سے سبق حاصل کریں۔) (ذم النسیان: ص ۱۲، معارف حکیم الامت: ص ۶۱۸)

اسی وعظ میں آگے چل کر حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے کثرت رائے کی لازمی حقانیت کے خلاف حضرت صدیق اکبرؓ کے اس طرزِ عمل کی مثال بھی دی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد جب بعض قبائل نے زکوۃ دینے سے انکار کر دیا، تو آپ نے ان کے خلاف جہاد کا ارادہ فرمایا۔ حضرت عمرؓ سمیت بیشتر صحابہ کرامؓ کی رائے یہ تھی کہ، ان لوگوں کے ساتھ جہاد نہ کیا جائے؛ لیکن حضرت صدیق اکبرؓ اپنی رائے پر قائم رہے اور اسی کے مطابق فیصلہ بھی ہوا اور بعد میں سب لوگوں نے یہ اعتراف کیا کہ صائب رائے یہی تھی۔

حضرت حکیم الامتؒ نے کثرت رائے کو معیارِ حق قرار دینے کے نظریے پر شرعی اور عقلی دونوں قسم کے دلائل سے تنقید فرمائی ہے، اور سادہ سادہ لفظوں میں ایسے حقائق بیان فرما دیے ہیں کہ، جب بھی کوئی شخص ٹھنڈے دل سے غور کرے گا، اسی نتیجے تک پہنچے گا چنانچہ جدید علم سیاست کے بعض حقیقت پسند ماہرین نے بھی ''جمہوریت'' کے ان نقائص کو تسلیم کیا ہے، ایک مشہور ماہر سیاست ایڈمنڈ بورک (Burke) لکھتا ہے:

''اکثریت کے فیصلہ کو تسلیم کرنا کوئی فطرت کا قانون نہیں ہے، کم تعداد بعض اوقات زیادہ مضبوط طاقت بھی ہو سکتی ہے اور اکثریت کی حرص و ہوس کے مقابلے میں اس کے اندر زیادہ معقولیت بھی ہو سکتی ہے، لہٰذا یہ مقولہ کہ ''اکثریت کے فیصلہ کو قانون بننا چاہیے'' اس میں افادیت اور پالیسی کی بھی اتنی ہی کمی ہے، جتنی حقانیت کی۔''

حکیم الامت قدس سرہ ایک اور وعظ میں فرماتے ہیں:

"اول تو کثرت رائے میں احمقوں کو جمع کیا جاتا ہے ان کی کثرت رائے تو حماقت ہی کی طرف ہوگی، پھر ان سے پہلے اپنی رائے منوالی جاتی ہے، اس سبق کی طرح پڑھا دیا جاتا ہے کہ ہم یوں کہیں گے، تم یوں کہہ دینا، جیسے وکیل گواہوں کو پڑھایا کرتے ہیں، اب۔۔۔۔۔ کثرت کیا خاک ہوئی۔

بعض جمہوریت پرست لوگوں نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے اس تبصرے کو ایک سطحی تبصرہ قرار دینے کی کوشش کی ہے، اور بعض لوگوں نے یہ بھی کہا کہ یہ ایک ایسے بزرگ کا تبصرہ ہے، جن کا میدان علم سیاست نہیں تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت کی نگاہ اپنی گوشہ نشینی کے باوجود زمانے کی دکھتی ہوئی رگوں پر ہوتی تھی۔ ان کا اصل ماخذ قرآن وسنت تھے اور وحی کی اسی روشنی نے انہیں وہ نور فراست عطا فرمادیا تھا، جس کے ذریعے وہ ان مسائل کو انتہائی سادگی سے بیان فرما گئے ہیں، جن کو لوگوں نے ایک مستقل فلسفہ بنا رکھا ہے، چنانچہ یہ تبصرہ بھی اسی فراست ایمانی کا نتیجہ تھا۔ علم سیاست بے شک آپ کا اصل میدان نہیں تھا، لیکن جو سچائی وحی کے نور سے معلوم ہوئی ہو، اسے رسمی علوم کی حاجت نہیں ہوتی۔ لیکن اس علمی سیاست کے وہ ماہرین بھی جنہوں نے پروپیگنڈے سے ذرا آزاد ہو کر سوچنے کی کوشش کی ہے وہ بھی بالآخر اسی نتیجے تک پہنچے ہیں۔ ڈاکٹر اے۔ اپادو رائے برصغیر میں اپنی سیاسی تصانیف کی وجہ سے خاصے مشہور ہیں۔ وہ "جمہوریت" کے تعارف اور اس کی کامیابی کی شرائط پر بحث کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ:۔

"جمہوریت کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ یہ شرائط (جن کے وجود پر جمہوریت کی کامیابی موقوف ہے) شاذونادر ہی پوری ہوئی ہیں۔ عملی اعتبار سے جمہوریت دراصل جہالت کی حکمرانی کا نام ہے۔ اس کی ساری توجہ کمیت اور تعداد (Quanity) پر رہتی ہے، کیفیت (Quality) پر نہیں۔

اس میں ووٹ گنے جاتے ہیں، انہیں تولا نہیں جاتا، شہریوں کی بہت بڑی تعداد اب بھی حکومت کو اپنے بنیادی وظائف زندگی میں سے نہیں سمجھتی، چنانچہ اس کو حکومت سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوتی، وہ کام کرتی اور کھیلتی رہتی ہے، اپنے پیشہ وارنہ اور فنی کاموں کو انجام دیتی رہتی ہے ہل چلاتی، بیج بوتی، فصلیں کاٹتی اور انہیں بیچتی رہتی ہے، اور یہ بھول جاتی ہے کہ وہ دراصل ملک کی حاکم ہے۔ جمہوریت میں یہ حقیقی خطرہ موجود ہے کہ شہریوں کی ایسی ذہنی تربیت نہیں ہوپاتی، جس کے ذریعہ وہ ان مسائل کے حقیقی مفہوم کا ادراک کرسکیں، جو انتخابات کے موقع پر ان کے سامنے فیصلے کے لیے آتے ہیں، لہذا وہ طبقاتی جذبات اور نعروں سے گمراہ ہو سکتے

ہیں، ”مسٹر ہنری مین“ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ جمہوریت کبھی بھی اکثریت کی حکمرانی کی نمائندگی نہیں کرسکتی، کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ عوام تو محض اپنے لیڈروں کی آراء کو تسلیم کرتے ہیں۔ (اسلام اور سیاست: ص ۳۰ تا ۳۶)

یہ ہوا جمہوریت کے بارے میں حضرت تھانویؒ، اور مفتی تقی صاحب دامت برکاتہم کا خیال جو سو فیصد صحیح ہے۔

مولانا عبدالرحمن کیلانی مرحوم جمہوریت کے بارے میں فرماتے ہیں:

مغربی جمہوریت میں پانچ ارکان ایسے ہیں جو شرعاً ناجائز ہیں:۔

(۱) حق بالغ رائے دہی بشمول خواتین۔ (سیاسی اور جنسی مساوات)

(۲) ہر ایک کے ووٹ کی یکساں قیمت۔

(۳) درخواست برائے نمائندگی اور اس کے جملہ لوازمات۔

(۴) سیاسی پارٹیوں کا وجود۔

(۵) کثرتِ رائے سے فیصلہ۔

ان ارکانِ خمسہ میں سے ایک رکن بھی حذف کردیا جائے، تو جمہوریت کی گاڑی ایک قدم بھی آگے نہیں چل سکتی۔ جبکہ اسلامی نظامِ خلافت میں ان ارکان میں سے کسی ایک کو بھی گوارا نہیں کیا جاسکتا۔ لہذا یہ دونوں نظام ایک دوسرے کی ضد اور ایک دوسرے سے متصادم ہیں، یعنی نہ تو جمہوریت کو مشرف بہ اسلام کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی نظامِ خلافت میں جمہوریت کے مروجہ اصول شامل کرکے اس کے سادہ، فطری اور آسان طریقۂ کار کو خواہ مخواہ مکدر اور مبہم بنایا جاسکتا ہے، وجہ یہ ہے کہ جمہوریت ایک لادینی نظام ہے اور اس کے علمبردار مذہب سے بیزار تھے، جبکہ خلافت کی بنیاد ہی خدا اس کے رسول اور آخرت کے تصور پر ہے، اور اس کے اپنانے والے انتہائی متقی اور بلند اخلاق انسان تھے۔

ہمارے خیال میں جیسے دن اور رات یا اندھیرے اور روشنی میں سمجھوتہ ناممکن ہے، بالکل ایسے ہی دین اور لادینی یا خلافت اور جمہوریت میں بھی مفاہمت کی بات ناممکن ہے۔ لہذا اگر جمہوریت کو بہر حال اختیار کرنا ہے تو اسے توحید و رسالت سے انکار کے بعد ہی اپنایا جاسکتا ہے ؎

باطل دوئی پرست ہے حق لاشریک ہے   شرکت میانِ حق و باطل نہ کر قبول

(خلافت جمہوریت: ص ۲۱۷ تا ۲۱۸)

حضرت مولانا یوسف لدھیانوی نور اللہ مرقدہ فرماتے ہیں:

کہا جاتا ہے کہ: ”جمہوریت میں عوام کی اکثریت کو اپنے نمائندوں کے ذریعہ حکومت کرنے کا حق دیا جاتا ہے“ یہ بھی محض ایک پُرفریب نعرہ ہے، ورنہ عملی طور پر یہ ہو رہا ہے کہ جمہوریت کے غلط فارمولے کے ذریعے ایک محدود سی اقلیت، اکثریت کی گردنوں پر مسلط ہوجاتی ہے! مثلاً: فرض کر لیجئے کہ ایک حلقۂ انتخاب میں ووٹوں کی کل تعداد پونے دو لاکھ ہے، پندرہ اُمیدوار ہیں، ان میں سے ایک شخص تیس ہزار ووٹ حاصل کرلیتا ہے، جن کا تناسب دُوسرے اُمیدواروں کو حاصل ہونے والے ووٹوں سے زیادہ ہے، حالانکہ اس نے صرف سولہ فیصد حاصل کئے ہیں، اس طرح سولہ فیصد کے نمائندے کو ۸۴ فیصد پر حکومت کا حق حاصل ہوا۔ فرمائیے! یہ جمہوریت کے نام پر ایک محدود اقلیت کو غالب اکثریت کی گردنوں پر مسلط کرنے کی سازش نہیں تو اور کیا ہے......؟ چنانچہ اس وقت مرکز میں جو حکومت ”کوس لمن الملک“ بجا رہی ہے، اس کو ملک کی مجموعی آبادی کے تناسب سے ۳۳ فیصد کی حمایت بھی حاصل نہیں، لیکن جمہوریت کے تماشے سے نہ صرف وہ جمہوریت کی پاسبان کہلاتی ہے، بلکہ اس نے ایک عورت کو ملک کے سیاہ و سفید کا مالک بنا رکھا ہے۔

الغرض! جمہوریت کے عنوان سے ”عوام کی حکومت، عوام کے لیے“ کا دعویٰ محض ایک فریب ہے، اور اسلام کے ساتھ اس کی پیوندکاری فریب در فریب ہے، اسلام کا جدید جمہوریت سے کوئی تعلق نہیں، نہ جمہوریت کو اسلام سے کوئی واسطہ ہے۔ ”ضدان لا یجتمعان!“ (یہ دو متضاد جمع نہیں ہوسکتیں)۔

(آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۷/۲۶۱)

خلاصۂ کلام یہ کہ جمہوریت اور اسلام کا کوئی دور دور تک تعلق نہیں، بلکہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہے۔

ہم مسلمانوں کے لیے ایک بڑا المیہ یہ بھی رہا ہے کہ مسلمانوں کا جدت پسند طبقہ جو مستشرقین پروپیگنڈوں سے متاثر ہوا ہے، اس نے جمہوریت کی تاکید کے لیے حدود و تجاوز کرتے ہوئے یہ دعویٰ تک کردیا کہ ”سیاست اور اسلام دونوں جدا جدا ہے، اسلام کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں، تو آیئے ایسے لوگوں کا شرعی حکم بھی معلوم کرتے چلیں۔

سیاست کو اسلام سے الگ ماننا اور اس کا حکم

علامہ محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم العالیہ نے سیاست اور اسلام کے جدا ہونے کے قائل نظریے کا مندرجہ ذیل حکم بیان کیا ہے: وأن هذه النظرية في الحقيقة نوع من أنواع الإشراك بالله من حيث أنها لا تعترف للدين بسلطة في الحياة المادية، وإنما تقصر سلطة الدين

على رسوم، وعبادات يمارسها المرء في خلوته، أو في معبده، فكأن الإله ليس أنها إلا في العبادات والرسوم۔

وأما الأمور الدنيوية فلها إله آخر (والعياذ بالله) ولذلک لم يزل المسلمون الراسخون يردون على هذه النظرية الزائغة في كل زمان ومكان؛ لأنه لا مجال لها في الإسلام الذي يؤمن بعقيدة التوحيد في أصح تعبيراتها، وأكمل صورها، والذي قرر الأحكام الإلهية في جميع شؤون الحياة بما فيها السياسة والاقتصاد فكان من واجب أهل العلم المسلمين أن يرفضوا هذه النظرية، ويردوا عليها ردًا علميا ناجحًا، وقد قاموا بهذا الواجب والحمد لله۔ (علامہ محمد تقی عثمانی۔ تکملہ فتح الملہم: ۳/۲۷۲)

یہ نظریہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنے کی ایک قسم ہے، اس لیے کہ یہ نظریہ مادی زندگی میں دین کے لیے اختیار کا قائل نہیں، بلکہ اس نظریہ کے حاملین دین کا اختیار عبادات اور رسوم تک محدود مانتے ہیں، جو کہ انسان خلوت اور عبادت کی جگہ میں کرتے ہیں، گویا اللہ تعالیٰ کی خدائی صرف عبادات اور رسوم تک محدود ہے اور دنیاوی کاموں کے لیے دیگر معبود ہیں۔ (العیاذ باللہ)

چونکہ یہ نظریہ ایک قسم کا شرک ہے محققین علماء نے اس نظریے کو ہر وقت اور ہر جگہ میں رد کیا ہے، اس قسم کے نظریے کے لیے کوئی گنجائش نہیں اُس اسلام میں جو کہ صحیح تعبیر اور اکمل صورت کے اعتبار سے عقیدۂ توحید کی تصدیق کرتا ہے، زندگی کے تمام شعبوں میں بشمول سیاست اور اقتصاد احکام الٰہی کو ثابت کرتا ہے، تو علماء پر لازم ہے کہ وہ یہ نظریہ چھوڑ دیں اور علمی انداز میں مناسب طریقے سے اس پر رد کریں اور الحمد للہ کہ آج تک علماء نے یہ فرض ادا کیا ہے اور اس نظریے کی علمی انداز میں تردید کی ہے اور اس موضوع پر مستقل کتابیں لکھی ہیں۔

ان لوگوں کی شرعی حیثیت جو سیاست کو اسلام سے جدا تصور کرتے ہیں:

پہلے اسلام کے ساتھ سیاست کا تلازم واضح ہوا تو اس سے اس کی شرعی حیثیت بھی معلوم ہوئی۔ سیاست کو الگ تصور کرنے والوں کے بارے میں علامہ حافظ ابن قیمؒ لکھتے ہیں: فمن ادعى السياسة ادعى الخلل في الشريعة وهذا يزاحم الكفر۔

(اسلام کا نظام سیاست و حکومت: ص ۲۱۴، ۲۱۵/ بحوالہ ابن قیم۔ الطریق الحکمیۃ: ص ۱۳)

اب ہمارے سامنے صرف دو ہی طریق اور دو ہی فریق ہیں۔ حضرت آدم اور ان کے ہم مسلک انبیاء

حضرت ابراہیمؑ وغیرہ کی راہ نبوت اور ہدایت کی راہ ہے اور اسی جماعت کا اتباع امن وامان کا ذمہ دار ہے، اس کے خلاف ابلیس اور اس کے متبعین نمرود وغیرہ کی راہِ شقاوت وضلالت ہے، اور اس جماعت کا اتباع فتنہ وفساد کا داعی اور ضامن ہے۔سوچو اور فیصلہ کرو! {فأي الفريقين أحق بالأمن إن كنتم تعلمون}

ترجمہ: اب دونوں فرقوں میں کون مستحق ہے دل جمعی کا، بولو! اگر تم سمجھ رکھتے ہو، کیا فقہ واجتہاد کی باریکیوں اور شرعی عمومی سیاست جانے بغیر کوئی شخص مسلم قیادت اور سیادت کا مستحق ہوسکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔

إنكم لاتصلحون للسيادة قبل معرفة الفقه والسياسة العامة۔

یقیناً تم سرداری کی، اسلامی فقہ اور عام شرعی سیاست جانے بغیر صلاحیت نہیں رکھتے۔

(اسلام کا نظام سیاست وحکومت ج ا ص ۲۲۰)

لاریب یہ دور مغربیت کا دور ہے، مغربی سیاست کا استیلاء ہے، مغربیت کے ہر بادہ خوار کو سرشار اور بدمست کئے ہوئے ہے، مگر یہ مستی وبادہ خواری تا کجے؟ یہ خمار اور اعراض عن الحق تا کجا؟ عنقریب ایک دن آنے والا ہے، یہ بحرانی کیفیت اور فساد انگیزی ختم ہوگی، حق کو فروغ اور باطل کو اضمحلال ہوگا، اے سیاست کے دعویدارو! وقت کا انتظار کرو! میں بھی انتظار کرتا ہوں۔

{فتربصوا إنامعكم متربصون} ترجمہ: سو منتظر رہو! ہم بھی تمہارے ساتھ منتظر ہیں۔

پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے کہ علماء اسلام سیاست نہیں جانتے، اور اگر جانتے ہیں تو قدیم اسلامی سیاست اس زمانہ کے نظریات اور اجتماعی اصول کی دنیا بالکل جدا ہے، یورپ سیاست کا مرکز ہے اور اس لیے اب نپولین، میکیاویلی، مسولینی، ہٹلر، اسٹالن اور مسٹر چرچل وغیرہم کی سیاست کا جاننا ضروری ہے اور جو شخص اس ضرورت کو پورا کرے وہی ہمارا قائد اعظم ہے، ممکن ہے یہ خیال انگریزی کتابوں کا اردو میں ترجمہ ہوتے ہوئے بھی بظاہر صحیح ہو یا غلط ہو، لیکن سوال یہ ہے کہ موجودہ نظریات قدیم نظریات سے اعلیٰ ہیں یا ادنیٰ؟ یا مساوی مرتبہ رکھتے ہیں؟ موخر الذکر میں علماء اسلام کی تنقیص حماقت ہے اور اگر ادنی ہے، تو پھر علماء اسلام کی تجہیل نہیں بلکہ صراحۃً اپنی تجہیل ہے۔

اول الذکر صورت میں محض زبانی باتوں سے کام نہیں چلتا فریقین کے نظریات میں تقابل کی ضرورت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خود انصاف پسند مغربی اہلِ سیاست کے اعتراف سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ یورپین سیاست وتمدن نے اسلام کے نظریاتِ حکمت وسیاست سے براہ راست استفادہ کیا ہے، قرآن وحدیث

کی روشنی میں خلافتِ راشدہ کا نظام ان کے بروئے کار آیا۔ اور خلافت راشدہ کے بعد خلافتِ بنی امیہ اور خلافت عباس کا دورِ حکومت شروع ہوا، جس نے خلافتِ راشدہ کے اصولِ اجتماعیہ سے استفادہ کیا اور اپنے نظام کو شاہی صورت میں چلایا، اس کے بعد قرونِ وسطیٰ یورپ کا کلیسائی دور بھیانک شکل میں ظاہر ہوا اور اسی اثناء میں مغربی علماء کی اجتماعیات نے علماء اسلام کی تصانیف اور طرزِ حکومت سے فائدہ اٹھایا، آج کون ہے؟ جو ابن خلدون ،فارابی اور دیگر علماء اسلام کی سیاسی تصنیفات سے یورپ کے حق میں مستفید ہونے کا انکار کر سکے؟۔

میکیاویلی، ابن خلدون کے اسلامی فکر کا مقلد ہے، بقول فرانسیسی عالم موسیو رینان ڈینہ نپولین کے سیاسی تصورات میں اسلام کا تصورِ حکومت کام کر رہا تھا اور بقول مصنف دورِ حاضر العالم الاسلامی ۲۸/اگست ۱۷۹۸ء کی یادداشت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نپولین انسانیت کی بہتری کے لیے قرآن حکیم کی سیاست پر نظام حکومت کی بنیاد رکھنا ضروری خیال کرتا تھا، ابونصر فارابی کی کتاب مبادی آراء اہل المدینہ سے اب تک ہماری متمدن دنیا اعلیٰ شہری سیاسی نظام سے لیکر میونسپلٹیاں تک کا نظام چلا رہی ہے اور کتاب مذکور کی مرہون منت ہے۔ تاریخی اعتبار سے چوتھی صدی کے وسط میں رسائل اخوان الصفا قلمبند ہوئے ،اخوان الصفا نے سیاست کو ایک مستقل فن قرار دیا اور سیاست کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا، یورپ نے ان رسائل سے بھی کافی استفادہ کیا، پروفیسر کلازیو نے ابن خلدون کو عصر حاضر کے علماء سیاست کا پیشوا اور استاد تسلیم کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

عظیم وجلیل بربری مورخ ابن خلدون نے قرونِ وسطیٰ میں اس وقت فن اجتماعیات، اقتصادیات، اور سیاسیات کے مبادیات کو پیش کیا، جب فرانسیسی اشتراکی کنسیڈرن، اشتراکیت کے بانی کارل مارکس، روسی ماہر سیاست پیکونن، ان نظریات کے پیش کرنے کے لیے اس دنیا میں موجود نہ تھے۔

بالآخر صفحات کی تنگ دامنی ہم کو اجازت نہیں دیتی، ورنہ ہم مزید دلائل سے ثابت کرتے کہ یورپ کی نظری سیاست علماء اسلام کی نظری سیاست کی مقلد اور رہین منت ہے، اور ظاہر ہے مقلد کا مرتبہ مجتہد اور امام سے نہیں بڑھ سکتا۔ رہی یورپ کی عملی سیاست وہ بالکل ڈپلومیسی، مکاری، بے حیائی، فتنہ وفساد اور نفاق سے پُر ہے۔ چنانچہ جارج ایلن نے کتاب جنس تمدن مین بطور اقتباس شائع کیا ہے۔

موجودہ تمدن کا سارا لب لباب منافقت ہے، لوگ اپنا عقیدہ ظاہر خدا پر کرتے ہیں، لیکن عملاً اپنی جانیں تک مال پر قربان کردیتے ہیں۔ زبانوں پر آزادی کا دعوی رہتا ہے، لیکن جو آزادی کے علمبردار ہوتے ہیں انہیں کو سزائیں ملتی ہیں دعویٰ مسیح کی پیروی کا ہے اور اطاعت مسولینی وغیرہ کی کیجارہی ہے۔ عزت کے الفاظ

عصمت کے متعلق استعمال کئے جاتے ہیں، لیکن عملی زندگیاں حرام کاری، اور آتشک کے لیے وقف ہیں۔ زبانی دادسچائی کی دیتے ہیں، لیکن عملاً اقتدار اور اختیار کی کرسیوں پر بددیانتوں ہی کو بٹھاتے ہیں، زبانوں پر اخوت کے نعرے ہیں لیکن جو بھائی ان کی جنگ یا وطنیت یا قومیت کے بدمستانہ جلوسوں میں شریک نہیں ہوتے، ان کے لیے یا تو جیل خانہ ہے یا جلاوطنی یا بندوق کی گولیاں۔

یہ ہے وہ مغربی سیاست اور یورپین زہر کہ، جس کا تریاق فقط اسلامی سیاست ہے۔

(اسلام کا نظام سیاست وحکومت ج ا ص ۲۲۴، ۲۲۵ / بحوالہ مقدمہ سیاسی معمہ لمولانا حسین احمد المدنی ؒ ص ۱۵)

مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ مسلمان جمہوریت کی مخالفت کر کے سیاست سے کنارہ کش ہوجائیں، ورنہ ان سے دونوں کو مزہ آجائے گا، وہ تو ایسا ہی چاہتے ہیں، لہذا اھون البلیتین پر عمل کرتے ہوئے، بہرحال مسلمانوں کو سیاست میں حصہ دار بننا ہوگا، البتہ اس اعتقاد کے ساتھ کہ، یہ طرز سیاست اسلام مخالف ہے، مگر دفاع کے لیے ہمارا، اس میں شرکت لازم اور ضروری ہے۔

اسلام چونکہ ایک عالمگیر مذہب ہے، اس میں ہر زمانہ اور ہر جگہ پنپنے کی مکمل صلاحیت ہے، وہ کبھی بھی اللہ تعالی کی مخلوق کی رہنمائی سے دستبردار نہیں ہوسکتا، اچھے سے اچھے یا برے سے برے حالات میں بھی وہ مشعل راہ ہے، لہذا علماء نے جب دیکھا کہ اب اسلامی سیاست یعنی خلافت مسلمانوں کی بدکرداری یا اللہ کی کسی مصلحت کی وجہ سے باقی نہیں ہے، تو جمہوری حالات میں مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے، اس پر غوروخوض کیا اور الحمد للہ مسلمانوں کی رہنمائی کرتے ہوئے جمہوریت کے سب سے اہم رکن ووٹ کی شرعی حیثیت پر روشنی ڈالی اور اس طرح مسلمانوں کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا۔ تو آیئے! اب ووٹ کے بارے میں احکام شرعیہ سے واقف ہوتے ہیں، تاکہ آنے والے انتخابات میں حکم شرعی کی رعایت کرتے ہوئے اپنے ووٹ کا استعمال کرسکیں۔

انتخابات میں ووٹ ووٹر اور امیدوار کی شرعی حیثیت:

اس سلسلہ میں حضرت مفتی شفیع صاحب فرماتے ہیں:

آج کی دنیا میں اسمبلیوں، کونسلوں، میونسپل وارڈوں اور دوسری مجالس اور جماعتوں کے انتخابات میں جمہوریت کے نام پر کھیل کھیلا جارہا ہے کہ زور وزر اور غنڈہ گردی کے سارے طاغوتی وسائل کا استعمال کر کے یہ چندروزہ موہوم اعزاز حاصل کیا جاتا ہے اور اسکے عالم سوز نتائج ہر وقت آنکھوں کے سامنے ہیں اور ملک وملت کے ہمدرد سمجھدار انسان اپنے مقدور بھر اس کی اصلاح کی فکر میں بھی ہیں، لیکن عام طور پر اس کو ایک ہار جیت کا

کھیل اور خالص دنیاوی دھندہ سمجھ کر ووٹ لیے اور دیئے جاتے ہیں۔ لکھے پڑھے دیندار مسلمانوں کو بھی اس طرف توجہ نہیں ہوتی کہ یہ کھیل صرف ہماری دنیا کے نفع نقصان اور آبادی یا بربادی تک نہیں رہتا؛ بلکہ اس کے پیچھے کچھ طاعت و معصیت اور گناہ وثواب بھی ہے، جس کے اثرات اس دنیا کے بعد بھی یا ہمارے گلے کا ہار عذاب جہنم بنیں گے، یا پھر درجات جنت اور نجاتِ آخرت کا سبب بنیں گے اور اگرچہ آج کل اس اکھاڑہ کے پہلوان اور اس میدان کے مرد، عام طور پر وہی لوگ ہیں جو فکر آخرت اور خدا اور رسول کی طاعت و معصیت سے مطلقًا آزاد ہیں اور اس حالت میں ان کے سامنے قرآن و حدیث کے احکام پیش کرنا ایک بے معنی وعبث فعل معلوم ہوتا ہے، لیکن اسلام کا ایک یہ بھی معجزہ ہے کہ مسلمانوں کی پوری جماعت کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہوتی ہر زمانہ اور ہر جگہ کچھ لوگ حق پرست بھی قائم رہتے ہیں، جنکو اپنے ہر کام میں حلال وحرام کی فکر اور خدا اور رسول کی رضا جوئی پیش نظر رہتی ہے نیز قرآن کریم کا یہ بھی ارشاد ہے وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرَىٰ تَنفَعُ الْمُؤْمِنِينَ یعنی آپ نصیحت کی بات کہتے رہیں کیونکہ نصیحت مسلمانوں کو نفع دیتی ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ انتخابات میں امیدواری اور ووٹ کی شرعی حیثیت اور ان کی اہمیت کو قرآن اور سنت کی رو سے واضح کر دیا جائے شاید کچھ بندگانِ خدا کو تنبیہ ہو اور کسی وقت یہ غلط کھیل صحیح بن جائے۔

امیدواری: کسی مجلس کی ممبری کے انتخابات کے لیے جو امیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہو، وہ گویا پوری ملت کے سامنے دو چیزوں کا مدعی ہے۔ ایک یہ کہ وہ اس کام کی قابلیت رکھتا ہے، جس کا امیدوار ہے۔ دوسرے یہ کہ دیانت و امانت داری سے اس کام کو انجام دے گا۔ اب اگر واقع میں وہ اپنے اس دعوی میں سچا ہے یعنی قابلیت بھی رکھتا ہے اور امانت و دیانت کے ساتھ قوم کی خدمت کے جذبہ سے اس میدان میں آیا ہے، تو اس کا یہ عمل کسی حد تک درست ہے، اور بہتر طریق اس کا یہ ہیکہ کوئی شخص خود مدعی بن کر کھڑا نہ ہو بلکہ مسلمانوں کی کوئی جماعت اس کو اس کام کا اہل سمجھکر نامزد کر دیں اور جس شخص میں اس کام کی صلاحیت ہی نہیں، وہ اگر امیدوار ہو کر کھڑا ہو تو قوم کا غدار اور خائن ہے، اس کا ممبری میں کامیاب ہونا ملک وملت کے لئے خرابی کا سبب تو بعد میں بنے گا، پہلے تو وہ خود غداری وخیانت کا مجرم ہو کر عذاب جہنم کا مستحق بن جائیگا۔ اب ہر وہ شخص جو کسی مجلس کی ممبری کے لئے کھڑا ہوتا ہے اگر اس کو کچھ آخرت کی بھی فکر ہے، تو اس میدان میں آنے سے پہلے خود اپنا جائزہ لے لے، اور سمجھ لے کہ اس ممبری سے پہلے تو اس کی ذمہ داری صرف اپنی ذات اور اپنے اہل وعیال تک محدود تھی، کیونکہ بنص حدیث ہر شخص اپنے اہل وعیال کا بھی ذمہ دار ہے اور اب کسی مجلس کی ممبری کے بعد

جتنی خلق خدا کا تعلق اس مجلس سے وابستہ ہے، ان سب کی ذمہ داری کا بوجھ اس کی گردن پر آتا ہے اور وہ دنیا و آخرت میں اس ذمہ داری کا مسئول اور جواب دہ ہے۔

ووٹ اور ووٹر: ۔کسی امیدوار ممبر کو ووٹ دینے کی از روئے قرآن وحدیث چند حیثیتیں ہیں، ایک حیثیت "شہادت" کی ہے کہ، ووٹر جس شخص کو اپنا ووٹ دے رہا ہے، اس کے متعلق اس کی شہادت دے رہا ہے کہ، یہ شخص اس کام کی قابلیت بھی رکھتا ہے اور دیانت وامانت بھی اور اگر واقع میں اس شخص کے اندر یہ صفات نہیں ہیں اور ووٹر یہ جانتے ہوئے اس کو ووٹ دیتا ہے، تو وہ ایک جھوٹی شہادت ہے جو سخت کبیرہ گناہ اور وبال دنیا و آخرت ہے۔

صحیح بخاری کی حدیث میں رسول کریم ﷺ نے "شہادتِ کاذبہ" کو شرک کے ساتھ کبائر میں شمار فرمایا ہے۔(مشکوۃ) اور ایک دوسری حدیث میں جھوٹی شہادت کو اکبر کبائر فرمایا ہے (بخاری ومسلم) جس حلقے میں چند امیدوار کھڑے ہوں اور ووٹر کو یہ معلوم ہے کہ قابلیت اور دیانت کے اعتبار سے فلاں آدمی قابلِ ترجیح ہے، تو اس کو چھوڑ کر کسی دوسرے کو ووٹ دینا اس اکبر کبائر میں اپنے آپ کو مبتلا کرنا ہے۔

اب ووٹ دینے والا اپنی آخرت اور انجام کو دیکھ کر ووٹ دے، محض رسمی مروت یا کسی طمع وخوف کی وجہ سے اپنے آپ کو اس وبال میں مبتلا نہ کرے۔دوسری حیثیت ووٹ کی "شفاعت" یعنی سفارش کی ہے کہ، ووٹر اس کی نمائندگی کی سفارش کرتا ہے، اس سفارش کے بارے میں قرآن کا یہ ارشاد ہر ووٹر کو اپنے سامنے رکھنا چاہئے ومن یشفع شفاعۃ حسنۃ یکن لہ نصیب منھا و من یشفع شفاعۃ سیئۃ یکن لہ کفل منھا ۔یعنی جو شخص اچھی سفارش کرے، اس کو اس سفارش کی وجہ سے ثواب کا حصہ ملے گا، اور جو شخص بری سفارش کرے، اس کو سفارش کی وجہ سے گناہ کا حصہ ملے گا۔اچھی سفارش یہی ہیکہ قابل اور دیانت دار آدمی کی سفارش کرے ، جو خلق خدا کے حقوق صحیح طور پر ادا کرے۔اور بری سفارش یہ ہیکہ نا اہل ، نالائق ، فاسق ، ظالم کی سفارش کر کے، اس کو خلق خدا پر مسلط کرے۔اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے ووٹوں سے کامیاب ہونے والا امیدوار اپنے پنج سالہ دور میں جو نیک یا بد عمل کریگا؛ ہم بھی اس کے شریک سمجھے جائینگے۔

ووٹ کی ایک تیسری شرعی حیثیت "وکالت" کی ہے۔ووٹ دینے والا اس امیدوار کو اپنا نمائندہ اور وکیل بناتا ہے، لیکن اگر یہ وکالت اس کے کسی شخصی حق کے متعلق ہوتی اور اس کا نفع نقصان صرف اس کی ذات کو پہنچتا ، تو اس کا یہ خود ذمہ دار ہوتا۔مگر یہاں ایسا نہیں کیونکہ یہ وکالت ایسے حقوق کے متعلق ہے، جن میں اس کے

ساتھ پوری قوم شریک ہے، اس لئے اگر کسی نا اہل کو اپنی نمائندگی کے لئے ووٹ دے کر کامیاب بنایا، تو پوری قوم کے حقوق کو پامال کرنے کا گناہ بھی اس کی گردن پر رہا۔

خلاصہ یہ ہیکہ ہمارا ووٹ تین حیثیتیں رکھتا ہے۔ایک شہادت، دوسرے سفارش، تیسرے حقوقِ مشترکہ میں وکالت۔تینوں حیثیتوں میں جس طرح نیک، صالح، قابل آدمی کو ووٹ دینا موجب ثواب عظیم ہے اور اس کے ثمرات اس کو ملنے والے ہیں، اسی طرح نا اہل یا غیر متدین شخص کو ووٹ دینا جھوٹی شہادت بھی ہے، اور بری سفارش بھی اور نا جائز وکالت بھی اور اس کے تباہ کن اثرات بھی اس کے نامہ اعمال میں لکھے جائیں گے۔

ضروری تنبیه :۔ مذکورالصدر بیان میں جس طرح قرآن وسنت کی رو سے یہ واضح ہوا کہ نا اہل ،ظالم، فاسق اور غلط آدمی کو ووٹ دینا گناہِ عظیم ہے، اسی طرح ایک اچھے نیک اور قابل آدمی کو ووٹ دینا ثواب عظیم ہے، بلکہ ایک فریضۂ شرعی ہے۔قرآن نے جیسے جھوٹی شہادت کو حرام قرار دیا ہے، اسی طرح سچی شہادت کو واجب ولازم بھی فرمایا ہے۔ارشادِ باری ہے: کونوا قوامین للہ شہداء بالقسط۔ اے ایمان والوں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے احکام کی پوری پابندی کرنے والے اور انصاف کی شہادت ادا کرنے والے رہو۔اور دوسری جگہ ارشاد ہے۔کونوا قوامین بالقسط شہداء للہ الخ اے ایمان والو! انصاف پر خوب قائم رہنے والے اور اللہ کی خوشنودی کے لیے سچی گواہی دینے والے رہو۔ان دونوں آیتوں میں مسلمانوں پر فرض کیا ہے کہ، سچی شہادت سے جان نہ چرائیں، اللہ کے لئے ادائیگی شہادت کے واسطے کھڑے ہوجائیں۔تیسری جگہ سورۂ طلاق میں ارشاد ہے واقیموا الشہادۃ للہ تم ٹھیک اللہ کے واسطے گواہی دو، یعنی اللہ کے لئے سچی شہادت قائم کرو۔ایک آیت میں یہ ارشاد فرمایا کہ، سچی شہادت کا چھپانا حرام اور گناہ ہے۔ولا تکتموا الشہادۃ ومن یکتمہا فانہ آثم قلبہ۔یعنی شہادت کو نہ چھپاؤ اور جو چھپائے اس کا دل گناہ گار ہے۔

ان تمام آیات نے مسلمانوں پر یہ فریضہ عائد کردیا ہے کہ سچی گواہی سے جان نہ چرائیں، ضرور ادا کریں آج جو خرابیاں انتخابات میں پیش آرہی ہیں، ان کی بڑی وجہ یہ بھی ہیکہ نیک صالح حضرات عموماً ووٹ دینے ہی سے گریز کرنے لگے، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا جو مشاہدہ میں آرہا ہے کہ ووٹ عموماً ان لوگوں کے آتے ہیں جو چند ٹکوں میں خرید لئے جاتے ہیں۔اور ان لوگوں کے ووٹوں سے جو نمائندے پوری قوم پر مسلط ہوتے ہیں وہ ظاہر ہیکہ کیسے قماش اور کس کردار کے لوگ ہوں گے، اس لئے جس حلقے میں کوئی بھی امیدوار قابل اور نیک معلوم ہو، اسے ووٹ دینے سے گریز کرنا بھی شرعی جرم اور پوری قوم وملت پر ظلم کا مرادف ہے۔اور اگر کسی حلقے

میں کوئی بھی امیدوار صحیح معنی میں قابل اور دیانت دار نہ معلوم ہو، مگر ان میں سے کوئی ایک صلاحیت کار اور خدا ترسی کے اصول پر دوسروں کی نسبت سے غنیمت ہو، تو تقلیل شر اور تقلیل ظلم کی نیت سے اس کو بھی ووٹ دینا جائز، بلکہ مستحسن ہے؛ جیسا کہ نجاست کے پورے ازالہ پر قدرت نہ ہونے کی صورت میں تقلیلِ نجاست کو اور پورے ظلم کو دفع کرنے کا اختیار نہ ہونے کی صورت میں تقلیل ظلم کو فقہائے نے تجویز فرمایا ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

خلاصہ یہ ہے کہ: انتخابات میں ووٹ کی شرعی حیثیت کم از کم ایک شہادت کی ہے، جس کا چھپانا بھی حرام ہے اور اس میں جھوٹ بولنا بھی حرام اس پر کوئی معاوضہ لینا بھی حرام، اس میں محض ایک سیاسی ہار جیت اور دنیا کا کھیل سمجھنا بڑی بھاری غلطی ہے، آپ جس امیدوار کو ووٹ دیتے ہیں، شرعاً آپ اس کی گواہی دیتے ہیں کہ یہ شخص اپنے نظریے اور علم و عمل اور دیانت داری کی رو سے، اس کام کا اہل اور دوسرے امیدواروں سے بہتر ہے، جس کام کے لئے یہ انتخابات ہو رہے ہیں، اس حقیقت کو سامنے رکھیں تو اس سے مندرجہ ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

(۱)......آپ کے ووٹ اور شہادت کے ذریعے جو نمائندہ کسی اسمبلی میں پہنچے گا، وہ اس سلسلے میں جتنے اچھے یا برے اقدامات کریگا، ان کی ذمہ داری آپ پر بھی عائد ہوگی آپ بھی اس کے ثواب یا عذاب میں شریک ہوں گے۔

(۲)......اس معاملے میں یہ بات خاص طور پر یاد رکھنے کی ہے کہ شخصی معاملات میں کوئی غلطی بھی ہو جائے، تو اس کا اثر بھی شخصی اور محدود ہوتا ہے ثواب وعذاب بھی محدود۔ قومی اور ملکی معاملات سے پوری قوم متاثر ہوتی ہے اس کا ادنی نقصان بھی بعض اوقات پوری قوم کی تباہی کا سبب بن جاتا ہے، اس لئے اس کا ثواب و عذاب بھی بہت بڑا ہے۔

(۳)......سچی شہادت کا چھپانا ازروئے قرآن حرام ہے، اس لئے آپ کے حلقہء انتخاب میں اگر کوئی صحیح نظریہ کا حامل و دیانت دار نمائندہ کھڑا ہے تو اس کو ووٹ دینے میں کوتاہی کرنا گناہ کبیرہ ہے۔

(۴)......جو امیدوار نظامِ اسلامی کے خلاف کوئی نظریہ رکھتا ہے، اس کو ووٹ دینا ایک جھوٹی شہادت ہے، جو گناہ کبیرہ ہے۔

(۵)......ووٹ کو پیسوں کے معاوضہ میں دینا بدترین قسم کی رشوت ہے اور چند ٹکوں کی خاطر اسلام اور ملک سے بغاوت ہے۔ دوسروں کی دنیا سنوارنے کے لیے اپنا دین قربان کر دینا کتنے ہی مال و دولت کے

بدلے میں ہو کوئی دانشمندی نہیں ہوسکتی۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ،وہ شخص سب سے زیادہ خسارے میں ہے، جو دوسروں کی دنیا کے لئے اپنا دین کھو بیٹھے۔(جواہر الفقہ:ج ۲ص ۲۹۰تا۲۹۵)

مفتی تقی صاحب مزید تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

انتخابات میں ووٹ کی اسلامی حیثیت

الحمد للہ و سلام علی عبادہ الذین اصطفی اما بعد!

موجودہ دور کی گندی سیاست نے الیکشن اور ووٹ کے لفظوں کو اتنا بدنام کردیا ہے کہ،ان کے ساتھ مکر وفریب، جھوٹ، رشوت اور دغابازی کا تصور لازم ذات ہو کر رہ گیا ہے، اسی لیے اکثر شریف لوگ اس جھنجھٹ میں پڑنے کو مناسب ہی نہیں سمجھتے ،اور یہ غلط فہمی تو بے حد عام ہے کہ الیکشن اور ووٹوں کی سیاست کا دین و مذہب سے کوئی واسطہ نہیں، اس سلسلے میں ہمارے معاشرے کے اندر چند در چند غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں، یہاں ان کا ازالہ بھی ضروری ہے۔

اپنے ووٹ کو استعمال کرنا شرعاً ضروری ہے

پہلی غلطی فہمی تو سیدھے سادے لوگوں میں اپنی طبعی شرافت کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے،اس کا منشاء اتنا برا نہیں، لیکن نتائج بہت برے ہیں، وہ غلط فہمی یہ ہے کہ آج سیاست مکروفریب کا دوسرا نام بن چکی ہے،اس لیے شریف آدمیوں کو نہ سیاست میں کوئی حصہ لینا چاہیے، نہ الیکشن میں کھڑا ہونا چاہیے،اور نہ ووٹ ڈالنے کے خرخشے (بکھیڑے)میں پڑنا چاہیے۔

یہ غلط فہمی خواہ کتنی نیک نیتی کے ساتھ پیدا ہوئی ہو،لیکن بہر حال غلط اور ملک وملت کے لیے سخت مضر ہے۔ماضی میں ہماری سیاست بلاشبہ مفاد پرست لوگوں کے ہاتھوں گندگی کا ایک تالاب بن چکی ہے،لیکن جب تک کچھ صاف ستھرے لوگ اسے پاک کرنے کے لیے آگے نہیں بڑھیں گے،اس گندگی میں اضافہ ہی ہوتا چلا جائے گا۔اور پھر ایک نہ ایک دن یہ نجاست خود ان کے گھروں تک پہنچ کر رہے گی، لہذا عقلمندی اور شرافت کا تقاضا یہ ہے کہ سیاست کے میدان کو ان لوگوں کے ہاتھ سے چھیننے کی کوشش کی جائے جو مسلسل گندا کر رہے ہیں۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشا فرمایا:

" الناس اذا رأوا لظا لم فلم یا خذو ا علی ید یه أو شک أن یعمهم الله بعقاب "

(جمع الفوائد: جلد ۲ ص ۵۱: بحوالہ ابوداؤد و ترمذی)

"اگر لوگ ظالم کو دیکھ کر اس کا ہاتھ نہ پکڑیں، تو کچھ بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سب پر اپنا عذاب عام نازل فرمائیں۔"

اگر آپ کھلی آنکھوں دیکھ رہے ہیں کہ ظلم ہو رہا ہے، اور انتخابات میں سرگرم حصہ لے کر اس ظلم کو کسی نہ کسی درجے میں مٹانا، آپ کی قدرت میں ہے تو اس حدیث کی رو سے یہ آپ کا فرض ہے کہ خاموش بیٹھنے کے بجائے ظالم کا ہاتھ پکڑ کر اس ظلم کو روکنے کی مقدور بھر کوشش کریں۔

بہت سے دین دار لوگ سمجھتے ہیں کہ، اگر ہم اپنا ووٹ استعمال نہیں کریں گے تو اس سے کیا نقصان ہوگا؟ لیکن سنئے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کیا ارشا فرماتے ہیں؟ حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ سے مسند احمد میں روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشا فرمایا:

" من اذل عنده مؤمن فلم ینصره وهو یقد ر علی ان ینصره اذ له الله علی رؤو س الخلائق۔" (ایضا: جلد ۲ ص ۵۱: بحوالہ ابوداؤد و ترمذی)

"جس شخص کے سامنے کسی مومن کو ذلیل کیا جا رہا ہو اور وہ اس کی مدد کرنے پر قدرت رکھنے کے باوجود مدد نہ کرے، تو اللہ تعالیٰ اسے (قیامت کے میدان میں) بر سر عام رسوا کرے گا۔

ووٹ نہ دینا حرام ہے

شرعی نقطہ نظر سے ووٹ کی حیثیت شہادت اور گواہی کی سی ہے، اور جس طرح جھوٹی گواہی دینا حرام اور نا جائز ہے۔ اسی طرح ضرورت کے موقع پر شہادت کو چھپانا بھی حرام ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

{ولاتکتموا الشهادة ومن یکتمها فإنه آثم قلبه} (البقرۃ)

"اور تم گواہی کو نہ چھپاؤ، اور جو شخص گواہی کو چھپائے، اس کا دل گنہگار ہے۔"

اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"من کتم شهادة اذا دعی الیها کان کمن شهد بالزور" (جمع الفوائد: طبرانی صفحہ ۶۲ جلد ۱)

"جس کسی کو شہادت کے لیے بلایا جائے، پھر وہ اسے چھپائے تو وہ ایسا ہے جیسے جھوٹی گواہی دینے والا"۔

بلکہ گواہی دینے کے لیے اسلام نے اس بات کو پسند کیا ہے کہ کسی کے مطالبہ کرنے سے پہلے ہی انسا

ن اپنا یہ فریضہ ادا کرے، اور اس میں کسی کی دعوت یا ترغیب کا انتظار بھی نہ کرے، حضرت زید بن خالد رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''الا اخبر کم بخیر الشھداء الذی یاتی بشھادتہ قبل ان یسئالھا'' (ایضاً: صفحہ ۹۲ جلد ا بحوالہ مالک و مسلم وغیرہ)

''کیا میں تمہیں نہ بتاؤں کہ بہترین گواہ کون ہے؟ وہ شخص ہے جو اپنی گواہی کسی کے مطالبہ کرنے سے پہلے ہی ادا کردے۔''

ووٹ بھی بلاشبہ ایک شہادت ہے، قرآن وسنت کے یہ تمام احکام اس پر بھی جاری ہوتے ہیں، لہٰذا ووٹ کو محفوظ رکھنا دینداری کا تقاضا نہیں، اس کا زیادہ سے زیادہ صحیح استعمال ہر مسلمان کا فرض ہے۔ یوں بھی سوچنے کی بات ہے کہ اگر شریف، دیندار اور معتدل مزاج لوگ انتخابات کے تمام معاملات سے بالکل یکسو ہو کر بیٹھ جائیں، تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ، وہ یہ پورا میدان شریروں، فتنہ پردازوں اور بے دین افراد کے ہاتھ میں سونپ رہے ہیں، ایسی صورت میں کبھی بھی یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ، حکومت نیک اور اہلیت رکھنے والے افراد کے ہاتھ میں آئے، اگر دیندار لوگ سیاست سے اتنے بے تعلق ہو کر رہ جائیں، تو پھر انہیں ملک کی دینی اور اخلاقی تباہی کا شکوہ کرنے کا بھی کوئی حق نہیں پہنچتا، کیوں کہ اس کے ذمہ دار وہ خود ہوں گے، اور ان کے حکام کا سارا عذاب وثواب ان ہی کی گردن پر ہوگا، اور خود ان کے آنے والی نسلیں اس شر وفساد سے کسی طرح محفوظ نہیں رہ سکیں گی، جس پر بند باندھنے کی انہوں نے کوئی کوشش نہیں کی۔

انتخابات خالص دنیاوی معاملہ نہیں

انتخابات کے سلسلے میں ایک دوسری غلط فہمی پہلی سے زیادہ سنگین ہے، چونکہ دین کو لوگوں نے صرف نماز روزے کی حد تک محدود سمجھ لیا ہے، اس لیے سیاست ومعیشت کے کاروبار کو وہ دین سے بالکل الگ تصور کر کے یہ سمجھتے ہیں کہ، یہ سارے معاملات دین کی گرفت سے بالکل آزاد ہیں۔ چنانچہ، بہت سے لوگ ایسے بھی دیکھے گئے ہیں، جو اپنی نجی زندگی کی نماز، روزے اور وظائف واوراد تک کے پابند ہوتے ہیں، لیکن نہ انہیں خرید وفروخت کے معاملات میں حلال وحرام کی فکر ہوتی ہے، اور نہ نکاح وطلاق اور برادریوں کے تعلقات میں دین کے احکام کی کوئی پروا کرتے ہیں۔

ایسے لوگ انتخابات کو بھی ایک خالص دنیاوی معاملہ سمجھ کر، اس میں مختلف قسم کی بدعنوانیوں کو گوارا کر لیتے ہیں، اور یہ نہیں سمجھتے کہ ان سے بڑا گناہ سرزد ہوا ہے، چنانچہ، بہت سے لوگ اپنا ووٹ اپنی دیانتدارانہ رائے

کے بجائے محض ذاتی تعلقات کی بنیاد پر کسی نااہل کو دے دیتے ہیں، حالانکہ وہ دل میں خوب جانتے ہیں کہ جس شخص کو ووٹ دیا جارہا ہے، وہ اس کا اہل نہیں، یا اس کے مقابلے میں کوئی دوسرا شخص اس کا زیادہ حق دار ہے، لیکن صرف دوستی کے تعلق، برادری کے رشتے، یا ظاہری لحاظ و مروت سے متاثر ہو کر وہ اپنے ووٹ کو غلط جگہ استعمال کر لیتے ہیں، اور کبھی خیال میں بھی نہیں آتا کہ شرعی و دینی لحاظ سے انہوں نے کتنے بڑے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ ووٹ ایک شہادت ہے اور شہادت کے بارے میں قرآن کریم کا ارشاد ہے:{واذا قلتم فاعدلوا ولو کان ذا قربی} ''اور جب کوئی بات کہو تو انصاف کرو، خواہ وہ شخص (جس کے خلاف بات کہی جارہی ہے) تمہارا قرابت دار ہی کیوں نہ ہو''۔

لہٰذا جب کسی شخص کے بارے میں ضمیر اور دیانت کا فیصلہ یہ ہو کہ جس شخص کو ووٹ دے رہے ہو، وہ ووٹ کا مستحق نہیں ہے، یا کوئی دوسرا شخص اس کے مقابلے میں زیادہ اہلیت رکھتا ہے، تو اس وقت محض ذاتی تعلقات کی بنا پر اسے ووٹ دے دینا ''جھوٹی گواہی'' کے ذیل میں آتا ہے۔ اور قرآن کریم میں جھوٹی گواہی کی مذمت اتنی شدت کے ساتھ کی گئی ہے کہ، اسے بت پرستی کے ساتھ ذکر فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہے:{ فاجتنبوا الرجس من الاوثان واجتنبوا قول الزور } ''پس تم پرہیز کرو بتوں کی نجاست سے اور پرہیز کرو جھوٹی بات کہنے سے''۔

اور حدیث شریف میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد مواقع پر جھوٹی گواہی کو اکبر الکبائر میں شمار کر کے اس پر سخت وعیدیں ارشا فرمائی ہیں۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا میں اکبر الکبائر (بڑے بڑے گناہ) نہ بتاؤں؟ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، اور والدین کی نافرمانی کرنا، اور خوب اچھی طرح سنو! جھوٹی گواہی، جھوٹی بات! حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تکیہ لگائے ہوئے بیٹھے تھے، جب جھوٹی گواہی کا ذکر آیا تو اٹھ کر بیٹھ گئے اور ''جھوٹی گواہی'' کا لفظ بار بار ارشاد فرماتے رہے؛ یہاں تک کہ ہم دل میں کہنے لگے کہ کاش! آپ خاموش ہو جائیں۔

(بخاری و مسلم، جمع الفوائد: صفحہ ۱۶۲ جلد ۲)

یہ وعیدیں تو صرف ووٹ کے اس غلط استعمال پر صادق آتی ہیں، جو محض ذاتی تعلقات کی بنا پر دیا گیا ہو، اور روپے پیسے لے کر کسی نااہل کو ووٹ دینے میں جھوٹی گواہی کے علاوہ رشوت کا عظیم گناہ بھی ہے۔

لہٰذا ووٹ ڈالنے کے مسئلہ کو ہرگز یوں نہ سمجھا جائے کہ یہ ایک خالص دنیوی مسئلہ ہے، اور دین سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یقین رکھئے کہ آخرت میں ایک ایک شخص کو اللہ کے سامنے کھڑا ہونا ہے، اور اپنے دوسرے اعمال کے ساتھ اس عمل کا بھی جواب دینا ہے کہ اس نے اپنی اس "شہادت" کا استعمال کس حد تک دیانت داری کے ساتھ کیا ہے۔

نا اہل کو ووٹ دینا شدید تر گناہ ہے

بعض حضرات یہ بھی سوچتے ہیں کہ اگر نا اہل کو ووٹ دینا گناہ ہے، تو ہم کون سے پاکباز ہیں؟ ہم صبح سے لیکر شام تک بے شمار گناہوں میں ملوث رہتے ہیں، اگر گناہوں کی طویل فہرست میں ایک اور گناہ کا اضافہ ہو جائے تو کیا حرج ہے؟

لیکن خوب سمجھ لیجئے کہ یہ نفس و شیطان کا سب سے بڑا دھوکہ ہے، اول تو انسان اگر ہر گناہ کے ارتکاب کے وقت یہی سوچا کرے، تو وہ کبھی کسی گناہ سے نہیں بچ سکتا، اگر کوئی شخص تھوڑی سی گندگی میں ملوث ہو جائے، تو اس کو اس سے پاک ہونے کی فکر کرنی چاہیے، نہ کہ وہ غلاظت کے کسی تالاب میں چھلانگ لگا دے۔

دوسری بات یہ ہے کہ گناہ گناہ کی نوعیتوں میں بھی بڑا فرق ہے، جن گناہوں کے نتائجِ بد، پوری قوم کو بھگتنے پڑیں، ان کا معاملہ پرائیوٹ گناہوں کے مقابلے میں بہت سخت ہے۔ انفرادی نوعیت کے جرائم، خواہ اپنی ذات میں کتنے ہی گھناونے اور شدید ہوں، لیکن ان کے اثرات دو چار افراد سے آگے نہیں بڑھتے، اس لیے ان کی تلافی بھی عموماً اختیار میں ہوتی ہے، ان سے توبہ و استغفار کر لینا بھی آسان ہے، اور ان کے معاف ہو جانے کی امید بھی ہر وقت کی جا سکتی ہے۔ اور اس کے برخلاف جس گناہ کا برا نتیجہ پورے ملک اور پوری قوم نے بھگتا ہو، اس کی تلافی کی کوئی صورت نہیں، یہ تیر کمان سے نکلنے کے بعد واپس نہیں آسکتا، اس لیے اگر کسی وقت انسان اس بدعملی سے آئندہ کے لیے توبہ کر لے تو کم از کم ماضی کے جرم سے عہدہ برا ہونا بہت مشکل ہے، اور اس کے عذاب سے رہائی کی امید بہت کم ہے۔

اس حیثیت سے یہ گناہ چوری، ڈاکہ، زنا کاری، اور دوسرے تمام گناہوں سے شدید تر ہے۔ اور اسے دوسرے جرائم پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

یہ درست ہے کہ ہم صبح و شام بیسیوں گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں، مگر یہ سب گناہ ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی وقت توبہ کی توفیق بخشے تو معاف بھی ہو سکتے ہیں، اور ان کی تلافی بھی کی جا سکتی ہے، لیکن اس کا مطلب

یہ ہرگز نہیں ہے کہ، ہم اپنی گردن ایک ایسے گناہ میں بھی پھنسالیں جس کی تلافی ناممکن اور جس کی معافی بہت مشکل ہے۔

بعض لوگ یہ بھی سوچتے ہیں کہ لاکھوں ووٹوں کے مقابلے میں ایک شخص کے ووٹ کی کیا حیثیت ہے ؟ اگر وہ غلط استعمال بھی ہوجائے، تو ملک وقوم کے مستقبل پر کیا اثر انداز ہوسکتا ہے؟

لیکن خوب سمجھ لیجئے کہ اول تو اگر ہر شخص ووٹ ڈالتے وقت یہی سوچنے لگے تو ظاہر ہے کہ پوری آبادی میں کوئی ووٹ بھی صحیح استعمال نہیں ہوسکے گا، پھر دوسری بات یہ ہے کہ ووٹوں کی گنتی کا جو نظام ہمارے یہاں رائج ہے، اس میں صرف ایک ان پڑھ، جاہل شخص کا ووٹ بھی ملک وملت کے لیے فیصلہ کن ہوسکتا ہے، اگر بے دین، بدعقیدہ اور بد کردار امیدوار کے بیلٹ بکس میں صرف ایک ووٹ دوسروں سے زیادہ چلا جائے، تو وہ کامیاب ہوکر پوری قوم پر مسلط ہوجائے گا۔اس طرح بعض اوقات صرف ایک جاہل اوران پڑھ انسان کی معمولی سی غفلت، بھول چوک یا بددیانتی بھی پورے ملک کو تباہ کرسکتی ہے، اس لیے مروجہ نظام میں ایک ایک ووٹ قیمتی ہے، اور یہ ہر فرد کا شرعی، اخلاقی، اور ملی فریضہ ہے کہ وہ اپنے ووٹ کو اتنی ہی توجہ اور اہمیت کے ساتھ استعمال کرے، جس کا وہ فی الواقع مستحق ہے۔(فقہی مقالات:۲/ ۲۸۷تا۲۹۵)

پڑھ لیا آپ نے ووٹ کتنا اہم ہے؟!!!

لہٰذا مسلمانوں سے گذارش ہے کہ، وہ حتی المقدور ووٹ دینے کی بھرپور کوشش کریں اور اچھے امیدواروں کو ووٹ دیں، اگر اچھے امیدوار نہ ہوں تو امیدواروں میں سے ایسے کو ووٹ دیں جو اسلام اور مسلمانوں اور ملک ووطن کے لیے کم سے کم نقصان دہ ہو، فرقہ پرست ذہنیت رکھنے والا نہ خود ہو اور نہ اس کی پارٹی ہو۔ورنہ اہل وطن کو بھی اور خاص طور سے مسلمانوں کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑیگا۔

یہ تو ہوئے سیاست کے ذریعہ ظاہری طور پر امن وامان وسکون کا ماحول بنانے کے بارے میں اسلام کے احکام، مگر مسلمان چونکہ صرف ظاہر پرست نہیں بلکہ وہ روحانیت اور علم غیب پر بھی ایمان رکھتا ہے، لہٰذا ووٹنگ کے ساتھ ساتھ اس پر بھی غور کرنا چاہیے، کہ اللہ پاک ظالم حکمرانوں کو کیوں مسلط فرماتے ہیں۔ کچھ روحانی اسباب وتدارک کا جاننا بھی ضروری ہے، اور اس سے کس طرح بچا جاسکتا ہے۔

تو آیئے! اسے بھی معلوم کرتے ہیں۔

مسلمان کو اس بات کا اعتقاد رکھنا چاہیے کہ، دنیا میں بدامنی اور ظالم حکمرانوں کے تسلط کے بہت سے

اسباب ہوسکتے ہیں ،مگر خود انسان کی بد کرداری اور بدعملی اس میں سب سے زیادہ مؤثر سبب ہے۔قرآن نے صاف اعلان کردیا ہے:

{ظہر الفساد فی البر و البحر بما کسبت ایدالناس} خشکی اور تری میں فساد برپا ہوگیا لوگوں کے کرتوت کی وجہ سے، تا کہ اللہ ان کو ان کے بعض کیے ہوئے (برے اعمال) کا مزہ چکھائے۔ اور لوگ (بد حالی کی وجہ سے)اللہ کی طرف رجوع کریں ،نیکی کی طرف راغب ہوجائیں۔ایسی بیسیوں آیات ہیں ،اور تاریخ بھی اس کی شاہد ہے: مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت کی برکت سے صحابہ میں صلاح آیا، تو اللہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفاء راشدین اور حضرت امیر معاویہؓ وغیرہ جیسے نیک سیرت اور عدل پسند لوگوں کو ان پر خلیفہ بنایا، مگر جب لوگ اسلامی اعمال سے دور ہونے لگے، تو پھر ان پر ان کے اعمالِ بد کی طرح برے حکام مسلط کردیے۔آج بھی جو ہم پر ظالم و فاسق حکام مسلط ہیں، اس کے ذمہ دار ہم خود بھی ہیں۔ایک حدیث میں ہے: ''اعمالکم عما لکم'' (رواہ القضاعی) تمہارے اعمال تمہارے عُمّال ،یعنی امیر ہیں۔اچھے اعمال کروگے ،تو اچھے حکمران ہوں گے اور برے اعمال کریں گے، تو برے حکام مسلط ہوں گے۔اب اگر ہم مسلمان اور سارے انسان اللہ کی نافرمانیاں کرتے رہیں گے بلکہ اس میں اضافہ ہی کرتے رہیں گے، تو آگے اور مزید انتہائی ظالم حکمران ہم پر اللہ کی جانب سے اعمالِ بد کے نتیجہ میں مسلط کیے جائیں گے۔اس لیے اس کے رسول اللہ ﷺ کا صاف ارشاد ہے، بلکہ قرآن سے بھی حدیثِ مذکور کے مفہوم کی تائید ہوتی ہے، ارشاد ہے:

{وکذلک نولی بعض الظالمین بعضا بما کانوا یکسبون} (الانعام:۱۲۹)

اور اس طرح ہم ظالموں کو ان کے کئے ہوئے اعمال کی وجہ سے ایک دوسرے پر مسلط کردیتے ہیں۔

معلوم ہوا ظالمین کے مسلط ہونے کے فیصلے اللہ کی جانب سے اسی وقت ہوتے ہیں، جب رعایا و عام لوگ اللہ کی نافرمانی کرنے لگتے ہیں۔

تو آیئے! ظالم حکمرانوں کے مسلط ہونے کے خاص اسباب کو معلوم کرتے ہیں تا کہ ایسے اسباب سے ہم احتراز کرسکیں۔

۱- گناہوں کا عام ارتکاب، خاص طور پر ناپ تول میں کمی:

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ فرماتے ہیں: ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری جانب متوجہ ہوئے، اور فرمانے لگے: ''اے جماعتِ مہاجرین پانچ چیزوں میں جب تم مبتلا کیے جاؤ گے، تو پانچ طرح کے عذاب سے دوچار ہوں گے اور اللہ سے میں تمہارے لیے پناہ طلب کرتا ہوں کہ تم اس سے دوچار نہ ہونے پاؤ،

وہ پانچ امور یہ ہیں:

(الف) جب کسی قوم میں فواحش عام ہوں گے، اللہ ان کو مہلک امراض میں مبتلا کریگا، اور وہ بھی ایسے مرض کہ اس سے پہلے کبھی کوئی اس میں مبتلا نہیں ہوا ہوگا۔

(ب) جب کوئی قوم ناپ تول میں کمی کریگی تو وہ قحط سالی سے دوچار ہوگی اور ان پر ظالم لوگوں کو حکمران بنایا جائے گا اسی طرح مہنگائی میں مبتلا ہوگی۔

(ج) اور جب زکوۃ کی ادائیگی میں کوتاہی ہوگی تو آسمان سے بارش روک دی جائے گی اور اگر جانور نہ ہو تو ہمیشہ کے لیے وہ بارش سے محروم کردیے جائیں۔

(د) اور جب کوئی قوم اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی کھلے عام مخالفت کریگی، تو ان کے دشمنوں کو ان پر مسلط کردیا جائے گا۔

(ھ) اور جب حکام اور امراء کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کو اپنا دستور بنانا ترک کردیں گے، تو آپس میں شدید اختلاف کا شکار کردیے جائیں گے۔

مذکورہ امراض میں اور اس کے عذاب میں آج پوری دنیا مبتلا ہے، اس سے نجات کا ایک ہی راستہ ہے، اللہ اور اس کے رسول کی مان کر چلنے کی کوشش کرنا۔

۲-: دنیا کی اندھی محبت

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: حضرت ثوبان کو مخاطب کرتے ہوئے، اے ثوبان! تمہارا کیا حال ہوگا، جب دنیا کی ساری قومیں تم پر ٹوٹ پڑیگی اور ہلہ بول دیگی، ایسے ہی جیسے بھوکا کھانے پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ حضرت ثوبانؓ فرماتے ہیں: میں نے کہا کیا اس وقت ہماری تعداد کم ہوگی؟ اس لیے ایسا ہوگا! ارشاد فرمایا:

بلکہ تم تو تعداد میں زیادہ ہوں گے، مگر تم سمندر کے جھاگ کی طرح بے وقعت ہوں گے، تمہارے دشمن کے دل سے تمہارا رعب ختم کردیا جائے گا اور تمہارے دلوں میں ''وھن'' پیدا ہوجائے گا، ہم نے دریافت کیا یہ ''وھن'' کیا ہے؟ تو فرمایا دنیوی زندگی سے (شدید) محبت اور موت سے کراہت۔

معلوم ہوا جب مسلمانوں میں دنیا کی محبت شدت اختیار کرجائے گی، تو اللہ ظالموں کو مسلط کردیگا۔ میں سمجھتا ہوں مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، آج حدیث پاک بالکل صحیح معنی میں ہم پر منطبق ہورہی ہے۔

۳-: مسلمانوں میں تکبر کا عام ہونا

نبی کریم صلی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جب میری امت متکبرانہ طور وطریق اختیار کرے گی، تو اللہ ان پر شر پسند حکام کو مسلط کر دیں گے''۔

آپ دیکھتے ہیں آج تکبر عام ہے، عالم، جاہل، غریب، فقیر، حاکم، محکوم، تاجر، کاشتکار، چھوٹا بڑا، مرد عورت ہر ایک اس مہلک مرض میں مبتلا ہے، یہ بھی شر پسندوں کے مسلط ہونے کا ایک سبب ہے۔

۴-: اللہ کے ذکر سے اعراض

ارشاد خداوندی ہے {ومن اعرض عن ذکری فان له معیشة ضنکا} یعنی جو ہمارے ذکر اور ہماری یاد سے اعراض اور غفلت کرے گا، تو وہ مصیبت زدہ زندگی سے دو چار ہوگا۔

آج ہم مسلمانوں نے نماز، ہر موقع کی مسنون دعائیں، صبح وشام کے اوراد و اذکار، اور اللہ سے دعا مانگنا ترک کر دیا، تو ہمارے لیے دنیا میں جینا دوبھر ہوگیا۔

۵-: امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے اعراض

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

جب کسی قوم میں برائی عام ہو جائے پھر ان میں جو لوگ اسے روک سکتے ہوں، وہ بھی نہ روکیں، تو اللہ ان پر اپنا عمومی عذاب نازل کر دیتے ہیں۔

محدثین نے اس کی تشریح میں لکھا ہے کہ عمومی عذاب کا مطلب یہ کہ، جب لوگ استطاعت کے باوجود برائی کرنے والوں کو نہ روکیں، تو اللہ ان کو زلزلوں اور طوفان او ر ظالم حکمرانوں کے ذریعہ عمومی عذاب سے دوچار کرتے ہیں۔

یہ ہوئے چند اسباب، جس سے ظالم حکمران مسلط کئے جاتے ہیں، اب ووٹ صحیح امیدوار کو دینے کے ساتھ ساتھ، ہم مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتلائے ہوئے، ان اسباب ہلاکت سے بھی اپنے آپ کو بچایا جائے۔ صرف ووٹ دیکر ظاہر پر اکتفاء سے کام نہیں چلے گا۔

خلاصہ یہ کہ ظالموں کے مسلط ہونے کے بنیادی اسباب چند ہیں:

۱-: مسلمانوں کا خاص طور پر اور عام طور پر تمام انسانوں کا بڑے بڑے گناہوں میں ڈوب جانا۔

۲-: ناپ تول میں کمی کرنا۔

۳-: انفرادی و اجتماعی زندگی میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت سے اعراض۔

۴-: دنیا سے شدید محبت کرنا، دنیا کمانے کی خاطر نماز، روزہ، ذکر و دعاء سب ترک کردینا۔

۵-: معاشرہ میں تکبر کا عام ہونا، یعنی ہر ایک کا عجب اور کبر میں اس طور پر مبتلا ہونا کہ کوئی کسی کی نہ سنے۔

۶-: ذکر اللہ سے اعراض، نماز اور دعاء وغیرہ سے فرار۔

یہ ہیں اسباب رئیسیہ۔

آیئے! ہم عہد کرتے ہیں کہ انشاء اللہ معاشرہ سے ان برائیوں کو مٹانے کی انتھک کوشش کریں گے۔

اللہ ظالمین سے ہماری اور تمام مسلمانوں کی حفاظت فرمائے، آمین۔

اگر ہم چاہتے ہیں دنیا سے فتنہ وفساد ختم ہوجائے اور امن وامان قائم ہوجائے، تو ہمیں قرآن کے بتلائے ہوئے اسباب ووسائل کو بروئے کار لانا ہوگا۔ حقوق انسانی کے نام پر جو نعرے لگائے جاتے ہیں یا جو کانفرسیں کی جاتی ہیں، اس کے فریب سے بچنا ہوگا؛ کیوں کہ وہ محض زبانی جمع خرچ ہے، عملی میدان میں ان کی تجاویز صفر کا درجہ رکھتی ہے، اگر ان کی قرار دادیں امن وامان قائم کردیتیں، تو کیوں U.N.O کے قیام کے ۶۵ سال بعد بھی، دنیا کے حالات تباہ کن ہیں، بلکہ مزید تباہی اور ہلاکت کی طرف بڑھ رہے ہیں، لہذا ہمیں مسلمانوں اور دیگر دنیا کو بتانا ہوگا کہ یہ راستہ ہے، امن وامان کے قائم کرنے کا اور الحمد للہ تاریخ اس پر شاہد عدل ہے، بلکہ یہ مجرب عمل ہے۔ دنیا میں اس اسلامی نظام نے امن وامان کی بے مثال نظیریں قائم کی ہیں۔

ازالہ فساد کا قرآنی علاج

۱-: دین محمدی پر ایمان اور اس کی سچی تابعداری:

ابو بکر ابن عیاش {ولا تفسدوا في الارض بعد اصلاحها} کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ، دنیا فساد زدہ تھی، پھر اللہ نے محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اس کو امن وامان اور ازالہ فساد کے لیے موضوع بنایا، لہذا اب جو طریقہ محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلاف بلائے گا، گویا وہ فساد پھیلائے گا۔

۲-: اسلامی بھائی چارگی:

مسلمانوں کو آپس میں محبت ومودت کے ساتھ رہنا ہوگا اور خاندانیت، وطنیت وغیرہ کے بجائے، ہر حال میں اسلامیت کو ترجیح دینا ہوگا اور ضرورت واضطرار کی صورت میں امن پسند غیروں سے رابطہ رکھنا ہوگا۔

{والذین کفروا بعضهم اولیاء بعض ولا تفعلوہ تکن فتنة في الارض وفساد کبیر} (سورہ انفال: ۷۳)

۳- : فساد کو ختم کرنے کے لیے کوشاں ہونا ضروری ہے:

صرف زبان خرچی سے کام نہیں چلے گا، بلکہ فساد اور مفسدین کو اپنی استطاعت کے بقدر روکنا ہوگا، جیسے مفسدین کو ووٹ نہیں دینا ہوگا، غیر اسلامی ریاست میں ایسے قوانین پر روک لگانے کی کوشش کرنا ہوگا، جو باعثِ فساد ہوں، اور ایسے قوانین جو فساد کو روکنے میں مؤثر ہوں، انہیں نافذ کروانے کے اقدامات کروانا ہوگا اور حکام کو عدل وانصاف کرنے پر مجبور کرنا ہوگا۔

۴- : ظالمین اور فاسدین کے لیے بددعا کرنی ہوگی۔ انبیاء کرام کا طریقہ بھی یہ رہا ہے، مثلاً حضرت لوط علیہ السلام نے کہا:

{رَبِّ انْصُرْنِي عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِيْنَ} نوح علیہ السلام نے کہا {رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْكَافِرِيْنَ دَيَّارًا} اسی طرح کہا {اني مغلوب فانتصر} اسی طرح جب اہل مکہ نے بہت ظلم کیا تو آپ ﷺ نے کہا ''اَللّٰهُمَّ عَلَيْكَ بِاَبِي جَهْلٍ وَعَلَيْكَ بِعُتْبَةَ وَعَلَيْكَ بِالْوَلِيْدِ وَاُمَيَّةَ وَعُقْبَة'' حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں یہ سب بدر میں قتل کیے گئے۔

قرآن وحدیث سے دفعِ ظلم کے لیے وارد دعائیں:

۱- : رَبِّ انْصُرْنِي عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِيْنَ۔

۲- : رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكَافِرِيْنَ دَيَّارًا۔

۳- : رَبِّ اِنِّي مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ۔

۴- : رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِلْقَوْمِ الظَّالِمِيْنَ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ۔

۵- : رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِيْنَ۔

۶- : رَبِّ فَلَا تَجْعَلْنِي فِي الْقَوْمِ الظَّالِمِيْنَ۔

۷- : رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا۔

۸- : اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَعُوْذُ بِكَ مِنْ زَوَالِ نِعْمَتِكَ وَتَحَوُّلِ عَافِيَتِكَ وَفُجَاءَةِ نِقْمَتِكَ وَجَمِيْعِ سَخَطِكَ۔ (مسلم)

۹- : اَللّٰهُمَّ اَنْجِ الْمُسْلِمِيْنَ مِنَ الظَّالِمِيْنَ اَللّٰهُمَّ اشْدُدْ وَطْأَتَكَ عَلَى الظَّالِمِيْنَ وَاجْعَلْهَا سِنِيْنَ كَسِنِيْ يُوْسُفَ يَجْهَرُ بِذٰلِكَ۔

۱۰-: اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ اَنْ اَضِلَّ اَوْ اُضَلَّ اَوْ اَزِلَّ اَوْ اُزَلَّ اَوْ اَجْهَلَ اَوْ یُجْهَلَ عَلَیَّ اَوْ اَظْلِمَ اَوْ اُظْلَمَ۔

۱۱-: اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَعُوْذُبِکَ مِنَ الْهَمِّ وَ الْحُزْنِ وَ نَعُوْذُبِکَ مِنَ الْعَجْزِ وَ الْکَسَلِ وَ نَعُوْذُبِکَ مِنَ الْجُبْنِ وَ الْبُخْلِ وَ نَعُوْذُبِکَ مِنْ غَلَبَةِ الدَّیْنِ وَ قَهْرِ الرِّجَالِ۔

۱۲-: اَللّٰهُمَّ لَا تُسَلِّطْ عَلَیْنَا بِذُنُوْبِنَا مَنْ لَا یَرْحَمُنَا۔

۱۳-: لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظَّالِمِیْنَ۔

۱۴-: حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَکِیْلُ۔

☆......☆......☆

فقہ وفتاویٰ:

الیکشن سے متعلق مسائل

مفتی محمد جعفر صاحب ملی رحمانی
صدر دارالافتاء-جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا

موجودہ دور کی سیاست اور ووٹ

مسئلہ(۱): موجودہ دور کی سیاست نے الیکشن اور ووٹ کے لفظوں کو اتنا بدنام کردیا ہے کہ ان کے ساتھ مکروفریب، جھوٹ، رشوت اور دغابازی ووعدہ خلافی کا تصور لازمِ ذات ہوکر رہ گیا ہے، اس لیے اکثر شریف لوگ اس جھنجھٹ میں پڑنے کو مناسب نہیں سمجھتے، اور یہ غلط فہمی تو بے حد عام ہے کہ الیکشن اور ووٹوں کی سیاست کا دین ومذہب سے کوئی واسطہ نہیں، یہ اور اس طرح کی دیگر غلط فہمیاں-خواہ کتنی ہی نیک نیتی کے ساتھ

پیدا ہوئی ہوں، لیکن بہر حال غلط اور ملک وملت کے لیے سخت مضر ہیں، کیوں کہ جمہوری نظام میں ووٹ کی غیر معمولی اہمیت ہے، جب تک ہم اپنے ووٹوں سے صاف ستھرے لوگوں کو منتخب نہیں کریں گے، ہم اپنے دینی، قومی اور ملکی مفادات کے تحفظ میں کامیاب نہیں ہوسکیں گے، لہٰذا مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اپنے حقِ رائے دہی (ووٹ دینے کا حق) کا بھرپور استعمال کریں۔(۱)

والحجة علی ماقلنا:

(۱) ما في " الموافقات في أصول الأحكام للشاطبي " : ومجموع الضروريات خمسة : وهي حفظ الدين والنفس والنسل والمال والعقل۔ (۲/۴، کتاب المقاصد، اعلام الموقعین ۳/۱۷۵، المقاصد الشرعیة: ص/۴۶)

ما في " فقه النوازل " : " ان ما لا یتم الواجب إلا به فهو واجب " ۔ (۳/۲۲۵) (نئے مسائل اور اسلامک فقہ اکیڈمی کے فیصلے: ص/۱۳۶، بائیسواں فقہی سمینار "امروہہ یوپی" بتاریخ: ۲۵-۲۷/ ربیع الثانی ۱۴۳۴ھ مطابق ۹-۱۱/ مارچ ۲۰۱۳ء)

اپنے آپ کو بحیثیت امیدوار پیش کرنا

مسئلہ (۲): عام حالات میں اسلامی مزاج کے مطابق عہدہ واقتدار کی طلب غیر مستحسن ہے، کیوں کہ عہدہ کی طلب وحرص (۱)، اور مسابقت ایک ایسی لذت ہے کہ اگر عہدہ چھن جائے تو پھر حسرتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے (۲)، لیکن اگر طلبِ عہدہ کے پیچھے کسی حظِ نفس کا دخل نہ ہو بلکہ محض انسانیت کا درد، امانت ودیانت کے ساتھ مفاداتِ عامہ کے تحفظ کا جذبہ کارفرما ہو، نیز انسانوں کو صحیح فائدہ پہنچانا، خلقِ خدا کو جبر وظلم سے نجات دلانا اور شرور وفتن سے بچانا مقصد ہو، فساق وفجار کے منتخب ہونے سے معاشرہ میں بے دینی کی ترویج کا خطرہ ہو، اور اس عہدہ ومنصب کے لائق دیگر افراد موجود نہ ہوں، بلکہ تنہا وہی شخص اس عہدہ کے لیے موزوں ہو، تو اب اس پر مذکورہ تمام مقاصد کے حصول کے لیے الیکشن میں اپنے آپ کو بحیثیت امیدوار پیش کرنا واجب ہے (۳)، البتہ وہ شخص از خود پرچۂ امیدواری داخل نہ کرے بلکہ دوسرے لوگوں کے ہاتھوں پرچۂ نامزدگی داخل کریں، تاکہ وہ طلبِ عہدہ میں متہم نہ ہو۔(۴)

(۱) ما في " مشكوة المصابيح " : عن عبد الرحمن بن سمرة قال: قال لي رسول الله ﷺ: " لا تسأل الامارة فإنك إن أعطيتها عن مسئلة وكلت إليها، وإن أعطيتها عن غير مسئلة أعنت عليها " ۔ متفق علیه۔ "عبدالرحمن بن سمرۃ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: عہدہ کی طلب مت کرو، اگر تم کو بلا طلب عہدہ مل جائے تو اللہ کی نصرت تم پر نازل ہوگی، اور طلب کے بعد کوئی عہدہ حاصل کرو تو اس کے ذمہ دار تم خود قرار پاؤ گے۔" (ص/۳۲۰، کتاب الامارۃ والقضاء)

(۲) ما في " مشكوة المصابيح " : عن أبي هريرة عن النبي ﷺ: " إنكم ستحرصون على الامارة وستكون ندامة

یوم القیامة فنعم المرضعة وبئست الفاطمة"۔ رواه البخاري۔ "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: عنقریب تم عہدوں کی مسابقت میں کود پڑو گے، حالانکہ یہ قیامت کے دن ندامت کا باعث ہوگا، وہ دودھ دینے والا اور لذت بخش عہدہ بہت اچھا لگتا ہے، لیکن جب عہدہ چھن جاتا ہے اور وہ دودھ کا تھن منہ سے نکل جاتا ہے، تو انتہائی برا لگتا ہے، پھر کیا حاصل ایسی لذتوں کا جن کے بعد حسرتوں کا سامنا کرنا پڑے۔" (ص/۳۲۰، کتاب الامارۃ والقضاء، الفصل الاول، قدیمی)

(۳) وفي "البحر الرائق": وليس النهي عن السؤال على إطلاقه بل مقيد بأن لا يتعين للقضاء، وأما إن تعين بأن لم يكن أحد غيره يصلح للقضاء وجب عليه الطلب صيانة لحقوق المسلمين ودفعا لظلم الظالمين۔ (۶/۲۵۹، كتاب القضاء، فتح القدير: ۷/۲۶۳، الفتاوى البزازية على هامش الهندية: ۵/۱۳۱، الأحكام السلطانية للماوردي: ص/۷۵)

وفي "القرآن الكريم": {اجعلني على خزائن الأرض إني حفيظ عليم}۔ "(یوسف نے) کہا مجھے ملک کے پیداواروں پر مامور کر دیجیے میں دیانت (بھی) رکھتا ہوں علم (بھی) رکھتا ہوں۔" (سورۂ یوسف: ۵۵)

وفي "التفسير الماجدي": "یعنی ایسے بڑے اور ذمہ دارانہ عہدہ کے لیے ضرورت دو ہی چیزوں کی ہوتی ہے، ایک دیانت و امانت، دوسرے اس کام سے واقفیت، سو مجھ میں یہ دونوں وصف موجود ہیں، حضرت یوسف کا عہدہ گویا آج کل کی اصطلاح میں وزیر مال (ریونیو منسٹر) اور وزیر خزانہ (فنانس منسٹر) کا جامع تھا۔ اجعلني على خزائن الأرض۔۔۔۔۔۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ جب مقصود نفع رسانی ہو نہ کہ نفس پروری، تو اپنے کو عہدہ و منصب کے لیے پیش کر دینا جائز نہیں، یہاں تک کہ غیر مسلم نظام حکومت کے ماتحت بھی عہدہ و منصب قبول کر لینا مطلق صورت میں حرام نہیں۔ اني حفیظ علیم۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ کسی کو واقف کرنے کے لیے اپنے فضل و کمال کو بیان کر دینا بالکل جائز ہے۔۔۔۔۔۔ مرشد تھانوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ آیت میں دلالت ہے کہ منصب و حکومت کی درخواست جب کہ اس میں مخلوق کا نفع ہو اور خود اپنا یہ ضرر نہ ہو کہ غیر اللہ میں مشغول ہو جائے قادح کمال نہیں۔" (ص/۴۹۷، سورۂ یوسف، آیت نمبر: ۵۵، حاشیہ نمبر: ۱۱۰)

وفي "بيان القرآن للتهانوي": اجعلني الخ۔ "معلوم ہوا کہ جب کسی کام کی لیاقت اپنے اندر منحصر دیکھے خود اس کی درخواست جائز ہے مگر مقصود نفع رسانی ہو نہ کہ نفس پروری۔" (۲/۲۵۴، ادارۂ تالیفات اشرفیہ پاکستان)

وفي "معارف القرآن": "اگر آج بھی کوئی شخص یہ محسوس کرے کہ کوئی عہدہ حکومت کا ایسا ہے جس کے فرائض کو کوئی دوسرا آدمی صحیح طور پر انجام دینے والا موجود نہیں، اور خود اس کو یہ اندازہ ہے کہ میں صحیح انجام دے سکتا ہوں، تو اس کے لیے جائز ہے بلکہ واجب ہے کہ اس عہدہ کی درخواست کرے، مگر اپنے جاہ و مال کے لیے نہیں، بلکہ خدمتِ خلق کے لیے، جس کا تعلق قلبی نیت اور ارادہ سے ہے، جو اللہ تعالیٰ پر خوب روشن ہے [قرطبی]۔" (۵/۹۱، قرطبی: ۹/۲۱۶-۲۱۷، روح المعانی: ۵/۲۲۵)

وفي "أحكام القرآن للتهانوي": ويستدل بالآية على أحكام۔۔۔ الأول جواز طلب الملك والمنزلة في الدنيا إذا كان الغرض صالحا كما فعل نبي الله يوسف عليه السلام حيث قال {اجعلني على خزائن الأرض إني حفيظ عليم} وكما طلب سليمان عليه السلام ملكا لا ينبغي لأحد من بعده۔ الخ۔

(۴/۲۳، أحكام القرآن لابن العربي: ۲/۱۶۲۹، سورة ص/۳۵)

(۴) علامہ کاسانی کتاب آداب القاضی میں تحریر فرماتے ہیں: "عہدۂ قضا کے طالب کو منصبِ قضا دینا جائز نہیں ہے، اگر اس میں اس عہدہ کی واقعی اہلیت موجود ہو تو باتفاق فقہاء ایسے شخص کو عہدۂ قضا دینا درست ہے، البتہ بہتر ہے کہ ایسے شخص کے بجائے کسی ایسے شخص کو تلاش کیا جائے جس میں عہدہ کی طلب نہ ہو اس لیے کہ طلب کی بنا پر انسان اپنے حق میں متہم ہو جاتا ہے۔" "وأما ترك الطلب فليس بشرط لجواز التقليد

بالإجماع وقبح جور تغلب الغالب لاخلاف فيه لأنه يقدر على القضاء بالحق لكن لا ينبغي أن يفعله لأن الغالب يكون متهما". (۹/۹۱، كتاب آداب القاضي) (غیر مسلم ملکوں میں آباد مسلمانوں کے مسائل اور ان کا شرعی حل: ص/۵۵)

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "اگر واقع میں وہ اپنے اس دعویٰ میں سچا ہے، یعنی قابلیت بھی رکھتا ہے اور امانت ودیانت کے ساتھ قوم کی خدمت کے جذبے سے اس میدان میں آیا ہے تو اس کا یہ عمل کسی حد تک درست ہے، اور بہتر طریق اس کا یہ ہے کہ کوئی شخص خود مدعی بن کر کھڑا نہ ہو، بلکہ مسلمانوں کی کوئی جماعت اس کو اس کام کا اہل سمجھ کر نامزد کردے۔" (جواہر الفقہ: ۲/۲۹۱، مطبوعہ دیوبند، غیر مسلم ملکوں میں آباد مسلمانوں کے مسائل اور ان کا شرعی حل: ص/۵۶، فتاویٰ حقانیہ: ۲/۳۱۵، انتخابات میں ووٹ، امیدوار بننا، نئے مسائل اور اسلامک فقہ اکیڈمی کے فیصلے: ص/۱۳۶، بائیسواں فقہی سیمینار "امروہہ یوپی" بتاریخ: ۲۵-۲۷/ ربیع الثانی ۱۴۳۴ھ مطابق ۹-۱۱/ مارچ ۲۰۱۳ء)

قانون سازاِداروں میں مسلم ممبران کی نمائندگی اور اُن کا دینی وملّی فریضہ

مسئلہ (۳): جن غیر مسلم ومسلم ملکوں میں قانون ساز ادارے مخالف شرع قوانین بناتے ہیں وہاں مسلمانوں کے لیے ان اداروں کا ممبر بننا درست ہونا چاہیے، اور ایسے ممبر شخص کو چاہیے کہ جمہوری حقوق سے استفادہ کرتے ہوئے خلافِ شرع قانون سازی کے خلاف آواز اٹھاتا رہے۔(۱)

(۱) ما في "معارف القرآن": "ایسے مکمل اختیار کے ساتھ کہ کسی خلاف شرع قانون پر مجبور نہ ہو کوئی کافر یا ظالم کی ملازمت اختیار کرلے تو اگرچہ اس کافر ظالم کے ساتھ تعاون کرنے کی قباحت پھر بھی موجود ہے، مگر جن حالات میں اس کو اقتدار سے ہٹانا قدرت میں نہ ہو اور اس کا عہدہ قبول نہ کرنے کی صورت میں خلق اللہ کے حقوق ضائع ہونے یا ظلم وجور کا اندیشہ قوی ہو تو بمجبوری اتنے تعاون کی گنجائش حضرت یوسف علیہ السلام کے عمل سے ثابت ہوجاتی ہے، جس میں خود کسی خلاف شرع امر کا ارتکاب نہ کرنا پڑے، کیوں کہ در حقیقت یہ اس کے گناہ میں اعانت نہیں ہوگی، گو سبب بعید کے طور پر اس سے بھی اعانت کا فائدہ حاصل ہوجائے، اعانت کے ایسے اسباب بعیدہ کے بارے میں بحالات مذکورہ شرعی گنجائش ہے، جس کی تفصیل حضرات فقہاء نے بیان فرمائی ہے، سلف صالحین صحابہ وتابعین میں بہت سے حضرات کا ایسے ہی حالات میں ظالم وجابر حکمرانوں کا عہدہ قبول کرلینا ثابت ہے [قرطبی ومظہری]۔" (۵/۹۲) (نئے مسائل اور اسلامک فقہ اکیڈمی کے فیصلے: ص/۱۳۶، بائیسواں فقہی سیمینار "امروہہ یوپی" بتاریخ: ۲۵-۲۷/ ربیع الثانی ۱۴۳۴ھ مطابق ۹-۱۱/ مارچ ۲۰۱۳ء)

مسلم ممبران کا دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا

مسئلہ (۴): جولوگ قانون ساز اداروں کے رکن منتخب ہوتے ہیں، جب انہیں حلف دلایا جاتا ہے اس وقت حلف میں دستور کی تمام دفعات تفصیلاً مذکور نہیں ہوتیں، بلکہ اجمالی طور پر دستور سے وفاداری کا حلف دلایا جاتا ہے، تو مسلم ممبر کو چاہیے کہ وہ حلف اٹھاتے وقت اپنے دل میں انہی دفعات کے ساتھ وفاداری کی نیت (توریہ) کرے، جو موافق شرع ہیں، نہ کہ ان دفعات کی جو شریعت کے خلاف ہیں، اس طرح حلف اٹھانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہونا چاہیے۔(۱)

(۱) ما في "معجم لغة الفقهاء": التورية: من ورّى، إرادة المتكلم بكلامه أمرا خفيا غير الظاهر منه

(Dissimulation)۔ (ص/۱۵۱، الموسوعة الفقهية : ۱۲/۲۲۸ ، تعريض)

مافي "صحيح البخاري": عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: "لم يكذب إبراهيم عليه السلام إلا ثلاث كذبات: ثنتين منهن في ذات الله عزّ وجلّ، قوله: {إني سقيم} [الصافات: ۸۹] وقوله: {بل فعله كبيرهم هذا} [الأنبياء: ۶۳] وقال: بينا هو ذات يوم وسارة، إذ أتى على جبار من الجبابرة فقيل له: إن هاهنا رجلا معه امرأة من أحسن الناس، فأرسل إليه فسأله عنها فقال: من هذه؟ قال: أختي، فأتى سارة قال: يا سارة ليس على وجه الأرض مؤمن غيري وغيرك، وإن هذا سألني فأخبرته أنك أختي فلا تكذّبيني۔ الخ۔ الحديث۔ (ص/۵۹۷، رقم الحديث: ۳۳۵۸، كتاب أحاديث الأنبياء، باب قول الله تعالى: {واتخذوا إبراهيم خليلا} [النساء: ۱۲۵]، احياء التراث العربي بيروت، الصحيح لمسلم: ۲/۴۵۸، كتاب الفضائل، باب من فضائل إبراهيم الخليل ﷺ، رقم الحديث: ۶۰۹۷، 2371، بيروت، عمدة القاري: ۱۳/۳۸۳، رقم الحديث: ۲۶۹۲، رياض الصالحين: ص/۴۲۸، باب بيان ما يجوز من الكذب، ط: دار القاسم الرياض، شرح مسلم للنووي: ۲۰۸-۲۰۹/۸، رقم الحديث: ۲۶۰۵، تكملة فتح الملهم: ۱۱/۳۲۲، رقم الحديث: ۲۶۰۵-۶۵۴۷، تفسير المظهري: ۶/۱۳۳-۱۳۴، سورة الأنبياء، الآية/۶۳، معارف القرآن: ۶/۱۹۷-۲۰۱)

مافي "معارف القرآن": "مصالح دینیہ کے لیے توریہ اختیار کیا جاسکتا ہے۔" (مستفاد از معارف القرآن مفتی شفیع رحمہ اللہ: ۶/ ۱۹۷-۲۰۱)

(حاشیۃ ابن عابدین: ۸/ ۲۵۳، باب الولی، قسم الأحوال الشخصیۃ، نئے مسائل اور اسلامک فقہ اکیڈمی کے فیصلے، ص/۱۳۶، بائیسواں فقہی سمینار "امروہہ یوپی" بتاریخ: ۲۵-۲۷/ ربیع الثانی ۱۴۳۴ھ مطابق ۹-۱۱/ مارچ ۲۰۱۳ء)

فرقہ واریت پر مبنی منشور والی پارٹی میں شرکت

مسئلہ (۵): جو سیاسی پارٹیاں کھلے طور پر مسلم دشمن ہیں اور ان کے منشور میں اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت شامل ہے، اور کسی شخص کی یہ نیت ہو کہ وہ پارٹی میں شریک ہوکر اس کے ایجنڈے کو بدلنے کی کوشش کریگا، تو ایسی پارٹی میں شامل ہونے کی گنجائش نہیں ہونی چاہیے، کیوں کہ اس طرح کی پارٹیوں میں شرکت اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت میں تعاون کے مترادف ہے، جو شرعاً ممنوع ہے۔ (۱)

(۱) مافي "القرآن الكريم": {ولا تعاونوا على الإثم والعدوان}۔ (سورة المائدة: ۲)

مافي "روح المعاني": فيعم النهي ما هو من مقولة الظلم والمعاصي ويندرج فيه النهي عن التعاون على الاعتداء والانتقام ـــــــ وعن ابن عباس رضي الله تعالى عنهما وأبي العالية أنهما فسرا الإثم بترك ما أمرهم به وارتكاب ما نهاهم عنه۔ (۴/۸۵، أحكام القرآن للجصاص: ۲/۳۸۱، مختصر تفسير ابن كثير: ۱/۴۷۸، التفسير المنير: ۲۱۸/۴، الوفاء بالعقود ومنع الاعتداء، والتعاون على الخير وتعظيم شعائر الله، تفسير المظهري: ۳/۴۸)

(نئے مسائل اور اسلامک فقہ اکیڈمی کے فیصلے، ص/۱۳۶، بائیسواں فقہی سمینار "امروہہ یوپی" بتاریخ: ۲۵-۲۷/ ربیع الثانی ۱۴۳۴ھ مطابق ۹-۱۱/ مارچ ۲۰۱۳ء)

مسلم خواتین کے لیے حق رائے دہی کا استعمال

مسئلہ(۶): خواتین انتخابات کے موقع پر اپنا حق رائے دہی (ووٹ) کا استعمال کرسکتی ہیں (۱)، بشرطیکہ پردہ اور دیگر امور شرعیہ کا لحاظ وخیال کریں، ورنہ ارتکابِ معصیت سے ووٹ کا ترک افضل ہے، حضرت مفتیٔ اعظم مفتی کفایت اللہ دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''عورتوں کا ووٹر بننا ممنوع نہیں ہے، ہاں! ووٹ دیتے وقت شرعی پردہ کا لحاظ رکھنا لازم ہوگا۔''(۲)

(۱) ما في ''أحكام القرآن للجصاص'' : {فرجل وامرأتان} ـــــــ فأفادنا إثبات هذا الإسم للرجل والمرأتين حتى يعتبر مجموعهما في جواز شهادتهم مع الرجل في سائر الحقوق ـــــــ فقال أبو حنيفة وأبو يوسف ومحمد وزفر وعثمان البتي : ''لا تقبل شهادة النساء مع الرجال لا في الحدود ولا في القصاص، وتقبل فيما سوى ذلک من سائر الحقوق''۔ (۱/۶۰۸، سورة البقرة : ۲۸۲)

(۲) ما في ''أحكام القرآن للجصاص'' :قال أبوبكر : هذه الآية دلالة على أن المرأة الشابة مأمورة بستر وجهها عن الأجنبين وإظهار الستر والعفاف عند الخروج لئلا يطمع أهل الريب فيهن ۔ (۳/۳۸۶، سورة الأحزاب : ۵۹)

ما في ''تفسير المظهري'' : لا يجوز للمرأة إبداء وجهها لرجل ذي ريبة غير الزوج والمحرم، فإن عامة محاسنها في وجهها فخوف الفتنة في النظر إلى وجهها أكثر منه في النظر إلى سائر أعضائها، وإن كان المراد بهما مواضع الزينة فمعنى الاستثناء إلا ما ظهر منها عند الضرورات ضرورة الخروج لقضاء الحوائج أو ضرورة الاستشهاد ونحو ذلک يدل على عدم جواز إبداء المرأة وجهها ۔ (۶/۳۷۷، قرطبي :۱۲/۲۲۷، سورة النور : ۳۱)

ما في ''جامع الترمذي'' : قال رسول الله ﷺ : ''المرأة عورة، فإذا خرجت استشرفها الشيطان''۔ (۱/۲۲۱)

ما في ''كنز العمال'' :قال عليه الصلاة والسلام: ''ليس للنساء نصيب في الخروج إلا مضطرة''۔ (۱۶/۱۶۳)

ما في ''الأشباه والنظائر لابن نجيم'' : ''الضرورات تبيح المحظورات''۔ ''الضرورة تتقدر بقدر الضرورة''۔ (۱/۳۰۷-۳۰۸)

(کفایت المفتی: ۹/۳۴۹، عورت کا ووٹر بننا الخ، فتاویٰ حقانیہ: ۲/۳۱۲، عورت کے لیے ووٹ کا حق استعمال کرنا، نئے مسائل اور اسلامک فقہ اکیڈمی کے فیصلے: ص/۱۳۶، بائیسواں فقہی سمینار ''امروہہ یوپی'' بتاریخ: ۲۵-۲۷/ربیع الثانی ۱۴۳۴ھ مطابق ۹-۱۱/مارچ ۲۰۱۳ء)

مسلم مخالف کو ووٹ دینا

مسئلہ(۷): ایسے امیدوار کو ووٹ دینا، یا ایسی جماعت میں شامل ہوکر الیکشن میں حصہ لینا جو اسلام اور مسلم دشمن ہو جائز نہیں (۱)، اس لیے کہ اس سے مسلمانوں کو نقصان ہوگا، اور جرم وسرکشی پر تعاون کرنا جائز نہیں ہے (۲)، البتہ بعض حضرات نے کہا ہے کہ مصلحت کے پیشِ نظر اس جماعت کے نظریہ سے متفق نہ ہوتے ہوئے،

اپنے ایمان کی حفاظت کی شرط کے ساتھ، مسلمانوں کے مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے شمولیت کی گنجائش نکل سکتی ہے۔(۳)

(۱) ما في "القرآن الكريم": قال تعالى: {ومن يشفع شفاعة حسنة يكن له نصيب منها، ومن يشفع شفاعة سيئة يكن له كفل منها}۔(النساء: ۸۵، سورة الحج: ۳۰، ۳۱، جمع الجوامع: ۷/۳۲۶)

ما في "سنن النسائي": قال عليه الصلاة والسلام: "لا طاعة في معصية الله إنما الطاعة في المعروف"۔

(۲/۱۶۶، كتاب البيعة، كنز العمال: ۵/۳۱۵، كتاب الخلافة مع الإمارة، رقم الحديث: ۱۴۳۹۷)

(۲) ما في "القرآن الكريم": {ولا تعاونوا على الإثم والعدوان}۔(سورة المائدة: ۲)

(۳) ما في "المبسوط": لما قال الإمام شمس الدين السرخسي: ولأن رسول الله ﷺ صالح أهل مكة عام الحديبية على أن وضع الحرب بينهم وبينهم عشر سنين فكان ذلك نظرا للمسلمين لمواطئة كانت بين أهل مكة وأهل خيبر وهي معروفة ولأن الإمام نصب ناظرا ومن النظر حفظ قوة المسلمين أولا فربما ذلك في الموادعة إذا كانت للمشركين شوكة۔

(۱۰/۸۶، كتاب السير، باب صلح الملوك والموادعة)

ما في "أحكام القرآن للجصاص": وقال الإمام أبو بكر الجصاص في تفسير هذه الآية {وإن جنحوا للسلم فاجنح لها} قال أبو بكر: قد كان النبي ﷺ عاهد حين قدم المدينة أصنافا من المشركين منهم النضير وبنو قينقاع وقريظة وعاهد قبائل من المشركين۔(۳/۹۰، سورة الأنفال: ۶۱)

ووٹ کی خرید وفروخت

مسئلہ(۸): شرعاً ووٹ کی حیثیت شہادت(۱)، شفاعت(۲) اور وکالت(۳) کی سی ہے، گویا کہ جس شخص کو ووٹ دیا جاتا ہے اس کے حق میں ملک وملت کے خیر خواہ ہونے کی شہادت دی جاتی ہے، متعلقہ وکیل اور نمائندہ بنایا جاتا ہے اور ان تینوں حیثیتوں کے اعتبار سے ووٹ مالِ متقوم نہیں یعنی ایسا مال نہیں ہے جس سے شرعاً نفع اٹھانا ممکن ہو، جب کہ شرعاً کسی بھی چیز کی خرید وفروخت جائز ہونے کے لیے اس کا مالِ متقوم ہونا ضروری ہے، اس لیے ووٹ کی خرید وفروخت شرعاً جائز نہیں ہے۔(۴)

(۱) ما في "رد المحتار": الشهادة إخبار صدق لإثبات حق۔(۱۱/۷۰)

(۲) ما في "الموسوعة الفقهية": الشفاعة هي التوسط بالقول في وصول شخص إلى منفعة دنيوية أو أخروية أو إلى خلاص من مضرة كذلك۔(۲۶/۱۳۱)

(۳) ما في "حاشية الجوهرة النيرة": الوكالة عقد تفويض ينيب فيه شخص شخصاً آخر عن نفسه في التصرف۔(۱/۶۳۶، كتاب الوكالة)

(۴) ما في "معجم لغة الفقهاء": المال المتقوم المال الذي يمكن الانتفاع به۔ things with commercial value۔

(ص/۳۹۷)

ما في "الفقه الإسلامي وأدلته": اتفق الفقهاء على صحة البيع إذا كان المعقود عليه مالاً متقوماً محرزاً موجوداً مقدوراً على تسليمه معلوماً للعاقدين لم يتعلق به حق الغير ۔ (۵/۳۴۹۶، البيوع الممنوعة بسبب المعقود عليه)

ووٹ کے عوض ملے روپیوں سے مسجد کی تعمیر

مسئلہ (۹): آج کل الیکشن کے موقع پر مختلف پارٹیوں کے امیدواروں کی طرف سے ووٹروں کو ان کے حق میں ووٹ ڈالنے کیلئے جو روپے دیے جاتے ہیں، وہ رشوت ہے، جو نص قطعی سے حرام ہے، اس لیے اس طرح کے روپے مسجد کی تعمیر، یا مسجد، عیدگاہ اور قبرستان کی زمین کی خریدی، اور ان کی چہار دیواری وغیرہ بنانے میں صرف کرنا شرعاً ناجائز وحرام ہے ۔(۱)

(۱) ما في "القرآن الكريم": {سمّٰعون للكذب أكّٰلون للسحت} ۔ (المائدة: ۴۲)

ما في "أحكام القرآن للجصاص": ولا خلاف في تحريم الرشا على الأحكام لأنه في السحت الذي حرمه الله في كتابه واتفقت الأمة عليه ۔ (۲/۵۴۱، باب الرشوة، سورة المائدة)

ما في "روح المعاني": عن ابن عمر رضي الله تعالى عنهما قال: قال رسول الله ﷺ: "كل لحم نبت من سحت فالنار أولى به، قيل: يا رسول الله! ما السحت؟ قال: الرشوة في الحكم" ۔ (۴/۲۰۵)

ما في "الجامع الصغير": "لعن الله الراشي والمرتشي الذي يمشي بينهما" ۔ (ص/۴۴۲، رقم الحديث: ۷۲۵۵، السنن للترمذي، رقم الحديث: ۱۳۳۶، كتاب الأحكام، السنن لأبي داود، رقم الحديث: ۳۵۸۰، كتاب الأقضية، باب كراهية الرشوة، السنن لابن ماجة، رقم الحديث: ۲۳۱۳، كتاب الأحكام، سبل السلام شرح بلوغ المرام: ۴/۱۴۷، الرشوة للقاضي والهدية، المال المأخوذ ظلماً: ۱/۲۰۸)

معتدہ کا ووٹنگ کے لیے نکلنا

مسئلہ (۱۰): جو عورت طلاق یا وفات کی عدت گذار رہی ہے، اس کے لیے ووٹ ڈالنے کے لیے گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں ہے، کیوں کہ الیکشن میں ووٹ ڈالنا ایسی ضرورت نہیں ہے، جس کی وجہ سے عدت میں عورت کو نکلنے کی اجازت دی جائے ۔(۱)

(۱) ما في "أحكام القرآن للجصاص": فيه نهي للزوج عن إخراجها ونهي لها عن الخروج، وفيه دليل على وجوب السكنى لها ما دامت في العدة لأن بيوتهن التي نهى الله عن إخراجهن منها هي البيوت التي كانت تسكنها قبل الطلاق فأمر بتبقيتها في بيتها ونسبها إليها بالسكنى كما قال: {وقرن في بيوتكن} ۔ (۳/۴۰۷، سورة الطلاق: ۱، البحر الرائق: ۴/۲۵۸/۴۲۵۹، فصل في الإحداد، رد المحتار: ۵/۱۸۰، كتاب الطلاق، فصل في الاحداد، مطلب الحق أن المفتي أن ينظر في خصوص الوقائع، مجمع الأنهر: ۲/۱۵۳، ۱۵۴، كتاب الطلاق، باب العدة) (فتاوی محمودیہ: ۲۰/۳۸)

ووٹر کی انگشت پر روشنائی مانع وضو ہے یا نہیں؟

مسئلہ (۱۱): ووٹنگ کے وقت حکومتی انتخابی عملہ ووٹر کی انگشت پر روشنائی لگاتا ہے، تاکہ ووٹر دھوکہ دے

کر دوبارہ ووٹ نہ ڈال سکیں، انگشت پر لگائی جانے والی یہ روشنائی دھونے پر بھی آسانی سے نہیں نکلتی، بلکہ کئی دنوں تک باقی رہتی ہے، اس کے انگلی پر لگے رہنے کی حالت میں وضوو غسل صحیح ہے، کیوں کہ وہ تہہ دار نہ ہونے کی وجہ سے وضو اور غسل میں بدن تک پانی پہنچنے کو نہیں روکتی۔(۱)

(۱) ما في "التنویر وشرحه مع الشامیة": لا یضر بقاء أثر کلون وریح۔ {۵۳۴/۱، کتاب الطهارة}

ما في "حاشیة الطحطاوي علی مراقي الفلاح": {وشرط صحته} أي الوضوء {ثلاثة}_____ الثالث زوال ما یمنع وصول الماء إلی الجسد لجرمه الحائل کشمع وشحم وقیدبه لأن بقاء دسومة الزیت ونحوه لا یمنع لعدم الحائل۔{ص/۶۲، کتاب الطهارة، البحر الرائق: ۱/۲۱۱، فتح القدیر: ۱/۲۰۹} (کتاب المسائل: ۱/۱۳۶)

ماہنامہ "شاہراہِ علم" جامعہ اکل کوا

بعد تصحیح شاعر اسلام مولانا ولی اللہ صاحب "ولی" قاسمی بستوی

نتیجۂ فکر (قاری) اسماعیل رحمانی

ناظم مدرسہ فیض القرآن کرمالا، شولاپور، مہاراشٹر

"شاہراہِ علم" ہے ظلمت میں ایک روشن دیا ... علمی دنیا میں ہے پھیلی چارسو اس کی ضیا

بدعتوں کے گھپ اندھیروں میں جو تھے بھٹکے ہوئے ... "شاہراہِ علم" ہے ان سب کے حق میں رہنما

تشنگانِ علم کی بجھتی ہے اس سے تشنگی ... علم و عرفاں کا زمانے میں یہ چشمہ ہو گیا

جذبۂ صادق لئے جو آ رہے ہیں، یہ انھیں ... علم دیں کے سیکھنے کا شوق کرتا ہے عطا

کیوں مطالعہ نہ کریں ہم "شاہراہِ علم" کا ... اس میں ہے جبکہ ذخیرہ علم و حکمت کا چھپا

اضافہ (شاعر اسلام مولانا ولی اللہ صاحب "ولی" قاسمی بستوی)

حضرتِ وستانوی کا اس میں شامل ہے خلوص ... جن کا نقشِ جاوداں ہے جامعہ اکل کوا

ہیں حذیفہ کی مسلسل محنتیں یوں جلوہ گر ... کہ زمانے میں مثالِ چاند یہ روشن ہوا

گلشنِ اردو ادب کا ہو گیا خوش رنگ پھول ... اور اچھا ہو گیا ہے ترجمانِ جامعہ

منسلک جو ہوگیا ہے ''شاہراہِ علم'' سے اس نے رحمانی خزینہ علم و فن کا پا لیا

☆......☆......☆

شاہراہِ علم

مثلِ خورشید اس زمن میں ''شاہراہِ علم'' ہے
ڈھال اس دورِ فتن میں ''شاہراہِ علم'' ہے
حضرتِ وستانوی کی یہ کرامت کم نہیں
ہند کے ہر باغ وبن میں ''شاہراہِ علم'' ہے

سیدافتخارحسین سازمارول

☆......☆......☆

جامعہ کے شب وروز

دینی ماحول میں عصری تعلیم کا آغاز

حضرت رئیس الجامعہ دامت برکاتہم کے پیرومرشد حضرت علامہ قاری صدیق احمد باندوی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، جوحضرت ناظم صاحب مولانا اسعد اللہؒ کے خلیفہ تھے،اوروہ حضرت تھانویؒ کے خلیفہ تھے۔آپ نے اپنے پیرومرشد کے ایماءواشارے پر ہی ۱۹۹۳ء میں آئی ٹی آئی کے ذریعے دینی ماحول میں عصری تعلیم کا آغاز فرمایا۔اورآج جامعہ اوراس کی شاخوں میں طبیہ کالج ،بی ای انجینئرنگ ،ڈپلوما انجینئرنگ ،بی فارمسی ،ڈی فارمسی ،بی ایڈ ،ڈی ایڈ وغیرہ پچیس سے زائد کالجز قائم ہوچکے ہیں ،جن میں چھ ہزار سے زائد مسلمان طلباء دینی ماحول میں عصری تعلیم حاصل کررہے ہیں ،جہاں ان کی عمدہ تربیت ہوتی ہے،قرآن کی تعلیم دی جاتی ہے، تعطیلات میں ساٹھ فیصد سے زائد کالجز کے طلبا جماعت میں جاتے ہیں ،جو کسی بھی کالج سے جماعت میں جانے والے طلبا کی سب سے بڑی تعداد ہے۔

''جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم''اکل کوا،ضلع نندربار،مہاراشٹر،کا قیام ۱۹۸۰ء میں دینی تعلیم کی غرض سے

عمل میں آیا۔ جامعہ کے اوّلین سرپرست عارف باللہ حبیب الامت حضرت قاری صدیق صاحب باندوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایماء پر بلکہ آپ ہی کی کوششوں کے نتیجہ میں؛ بعد ازاں ۱۹۹۳ء میں عصری تعلیم دینی ماحول ہونی چاہیے۔اس ضرورت کے پیش نظر سب سے پہلے I T I اور B U M S کالج کا قیام عمل میں آیا، اس کے بعد جامعہ کامپلیکس میں یکے بعد دیگرے ۱۲ر کالجز قائم ہو چکے ہیں ۔**وللہ الحمد علی ذالک!**

مادیت کے اس دور میں ایمان کی حفاظت مسلمانوں کی سب سے پہلی ترجیح ہونی چاہیے اور اس کے لیے دینی ماحول ازحد ضروری ہے۔

عربی میں کہاوت ہے "الانسان ابن البیئۃ" انسان کو جیسا ماحول ملتا ہے وہ اس میں ڈھل جاتا ہے۔ اسی لیے آج سے تقریباً ساٹھ ستر سال پہلے حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی نے کہا تھا: "مسلمان محکومیت کے اس دور میں اتنا کام اسی تعلیم کے متعلق اپنے ذمہ اگر اور لے لیں یعنی ہر تعلیم گاہ کے ساتھ ساتھ مسلمان طلباء کے لیے خاص اسلامی اقامت خانے بھی قائم کئے جائیں اور ان اقامت خانوں کی نگرانی ارباب تقویٰ و دیانت کے سپرد کی جائے، ان کا ماحول بالکلیہ اسلامی ماحول رکھا جائے گا" تو مغربی تعلیم حاصل کرنے والوں کی زندگی (ان شاء اللہ) اسلامی زندگی میں تبدیل ہو جائے گی۔ (پاک و ہند میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت: ج ۲/ص ۹)۔ مسلمانوں کا سب سے بڑا قیمتی سرمایہ ایمان ہے، ایمان کو بچانے کی کوشش ہم پر فرض ہے۔ لہٰذا اپنے بچوں کو مغرب زدہ ماحول سے دور رکھ کر دینی ماحول میں عصری تعلیم دینے کی فکر کریں، تاکہ سعادت دارین حاصل ہو۔

جامعہ کامپلیکس کی خصوصیات اور سہولتیں

(۱) ہر ہاسٹل میں نماز کے لیے عبادت گاہ موجود۔ (۲) لڑکیوں اور لڑکوں کے عصری تعلیم کے ساتھ ساتھ بعد مغرب دینی تعلیم کا انتظام۔ (۳) عمدہ رہن سہن اور کھانے کا اسلامی طریقہ پر انتظام۔ (۴) ہر ہفتہ ہاسٹلوں میں علمائے کرام کے بیانات۔ (۵) عبادت گاہوں میں فضائل اعمال اور بنیادی مسائل کی تعلیم۔ (۶) لڑکیوں کو مکمل اسلامی نقاب میں تعلیم۔ (۷) ادارہ کے پاس مسلم مائنوریٹی (Muslim Minority) اسٹیٹس موجود۔ (۸) احاطہ میں اسپتال کی سہولت مہیا۔ (۹) تمام کالجز اور اسکولیں سینٹرل

گورنمنٹ اور ریاستی سرکار سے افیلائٹیڈ (منظور شدہ) ہیں۔ (۱۰) تجربہ کار اور باکمال اساتذہ، ہر فن سے متعلق کتابوں سے آراستہ لائبریریاں، آلات ووسائل سے بھرپور لیبوریٹریاں اور دینی وعصری تعلیم وتربیت کا بہترین انتظام۔

جامعہ کالجز ایک نظر میں

ذیل میں جامعہ کے کالجوں کی تفصیلات اور داخلہ کی لیاقت تحریر کی جارہی ہے؛ تاکہ اس میں داخلہ لینے والے طلبا اوران کے سرپرستان آسانی کے ساتھ رجوع کرسکیں۔

حکومت سے منظور شدہ جامعہ اکل کوا کے ماتحت چلنے والے تعلیمی ٹریڈ کی وضاحت

ITI

شمار	مدت	ایڈمیشن لیاقت	ٹریڈ کا نام
۱	۲/سال	۱۰/کلاس پاس	میکینک موٹر ویکل MMV
۲	" "	" " "	الیکٹریشن
۳	" "	" " "	فیٹر
۴	" "	" " "	ریفریزیشن اینڈ ایرکنڈیشن RAC
۵	" "	" " "	سِول ڈرافشن مین
۶	۱ "	" " "	کمپیوٹر اوپریٹر، اینڈ اسسٹن
۷	" "	۸" "	پلمبر
۸	" "	" " "	ویلڈر

مقام اکل کوا، ضلع نندوربار، مہاراشٹر ۴۲۵۴۱۵

فون 02567-252326 موبائل نمبر 09423192456

جامعہ اے۔جی۔یونانی میڈیکل کالج، اکل کوا

شمار	مدت	لیاقت	ٹریڈ کا نام
۱	ساڑھے ۴ سال ایک سال (انٹرشیپ)	HSC (سائنس) PCB 45% مارکس اردو لازم۔	BUMS بیچرل آف یونانی مڈیسن اینڈ سرجری

ایڈمیشن کے لیے جون، جولائی، میں رابطہ کریں۔

پرنسپل اے جی یونانی مڈیکل کالج اکل کوا، ضلع نندوربار، مہاراشٹر ۴۲۵۴۱۵ فیکس- 02567-252020

فون 02567-252326 موبائل نمبر 09020601333

جامعہ پالی ٹیکنک

شمار	ٹریڈ کا نام	لیاقت	مدت
۱	ڈپلوما کمپیوٹر انجینئرنگ	۱۰ ویں پاس (میتھس، سائنس، انگلش)	۳ سال
۲	ڈپلوما الیکٹرونکس اینڈ ٹیلی کمیونیکشن	" " "	" "
۳	ڈپلوما انفارمیشن ٹیکنالوجی (IT)	" " "	" "
۴	ڈپلوما میکینکل انجینئرنگ	" " "	" "
۵	ڈپلوما الیکٹریکل انجینئرنگ	" " "	" "
۶	ڈپلوما آٹوموبائل	" " "	" "
۷	ڈپلوما سِویل انجینئرنگ	" " "	" "

جامعہ پالی ٹیکنک

مقام اکل کوا، ضلع نندوربار، مہاراشٹر ۴۲۵۴۱۵

موبائل نمبر 09875444555-09423192466

www Jamia polytechnic com

جامعہ انسٹی ٹیوٹ آف انجینئرنگ اینڈ مینیجمینٹ اسٹڈیز اکل کوا

شمار	ٹریڈ کا نام	لیاقت	مدت

۱	میکینکل انجینئرنگ	۱۲ رکلاس پاس P C M کے ساتھ ۴۵% ضروری ہے	۴ رسال
۲	سِول انجینئرنگ	" " " "	" "
	الیکٹریکل انجیئرنگ	" " " "	" "
	الیکٹرونک اینڈ ٹیلیکمیونکسن انجیرنگ	" " " "	" "
	کمپیوٹر انجیرنگ	" " " "	" "

مقام اکل کوا، ضلع نندوربار، مہاراشٹر ۴۲۵۴۱۵

فون 02567-252524

موبائل نمبر 08975444555 -09970387726

www jamsakk com

ڈی فارمسی کالج اکل کوا

ٹریڈ کا نام	لیاقت	مدت
ڈیگری فارمسی کالج	۱۲ رسائنس پاس	۲ رسال

مقام اکل کوا، ضلع نندوربار، مہاراشٹر ۴۲۵۴۱۵

فون 02567-252815 موبائل نمبر 09423192466

بی، فارمسی کالج اکل کوا

بیچرل آف فارمسی B Pharmacy	۱۲ رکلاس پاس سائنس PCB 45% مارکس کے ساتھ	۴ رسال

مقام اکل کوا، ضلع نندوربار، مہاراشٹر ۴۲۵۴۱۵

فون 02567-252815 موبائل نمبر 09833345404

علی الانہ فارمیسی کالج اکل کوا

ٹریڈ کا نام	لیاقت	مدت
ایم فارمسی (ماسٹر آف فارمسی) ☆ کوالیٹی ایسیورنس ☆ فارماسوٹکس ☆ فارماکیسٹری	بی فارم پاس (فسٹ کلاس) اور مہاراشٹر CET امتحان پاس ہونا ضروری ہے	۲ رسال

مقام اکل کوا، ضلع نندوربار، مہاراشٹر ۴۲۵۴۱۵

فون 02567-252815 موبائل نمبر 09833345404

جامعہ ڈی ایڈ کالج اکل کوا

شمار	ٹریڈ کا نام	لیاقت	مدت
۱	ڈی ایڈ (ڈپلوما ایجوکیشن) مہاراشٹر کے لیے اردو PTC	۱۲ رکلاس پاس 45% اردو میڈیم	۲ رسال
۲	ڈی ایڈ، مراٹھی میڈیم	۱۲ رکلاس پاس 45% مراٹھی میڈیم	۲ رسال

جامعہ ڈی ایڈ کالج

مقام اکل کوا، ضلع نندوربار، مہاراشٹر ۴۲۵۴۱۵

فون 02567-252994 موبائل نمبر 09423192466

جامعہ بی ایڈ کالج

لیاقت	ٹریڈ کا نام	شمار
گریجویشن	بی ایڈ انگریزی مراٹھی	۱

نوٹ: بی ایڈ میں ایڈمیشن کے لیے (CET) امتحان ضروری ہے

جامعہ بی۔ایڈ کالج ،اکل کوا،ضلع نندوربار،مہاراشٹر ۴۲۵۴۱۵

فون 02567-203080 موبائل نمبر 09423192466

جامعہ مولانا ابوالکلام اردو میڈیم ہائے اسکول اینڈ جونیئر کالج ،اکل کوا

ہائی اسکول :۸ تا ۱۰ تک اردو میڈیم ،انگریزی میڈیم

جونیئر کالج :۱۱ تا ۱۲ سائنس (۱) اردو اینڈ انگریزی میڈیم

فون نمبر: 02567- 252610

موبائل نمبر 09423192466 -09823147218

وسئی والا آئی ،ٹی ،آئی اکواڑہ بھاؤنگر

مدت	لیاقت	ٹریڈ کا نام	شمار
۲ رسال	۱۰ ر ویں پاس	الیکٹریشین	۱
۱ رسال	” ”	میکینک ڈیزل	۲
” ”	” ”	Copa	۳
” ”	۸ ر ویں پاس	ویلڈر	۴
۲ رسال	” ”	وائرمین	۵

پرائیوٹ کورس

(۱) آرگن ویلڈنگ ۴ رمہینہ

(۲) مِگ ویلڈنگ ۲/سال

نوٹ: کھانے اور رہنے کا پورا انتظام ہے۔

پتہ: وسئی والا آئی، ٹی، آئی دارالعلوم اکواڑا بھاؤنگر

فون: 0278-2564086 **موبائل نمبر:** 09825606044-09979656565

مولانا ابوالکلام آزاد آئی، ٹی، آئی احمد نگر مہاراشٹر

شمار	ٹریڈ کا نام	لیاقت	مدت
۱	الیکٹریشین	۱۰/پاس	۲/سال
۲	فیٹر	۱۰/پاس	
۳	کوپا	۱۰/پاس	۱/سال

نوٹ: کھانے رہنے کا پورا انتظام

پتہ: مولانا ابوالکلام آزاد، آئی، ٹی، آئی احمد نگر، پارا پچھلی، پوسٹ بھنگاڑ، احمد نگر مہاراشٹر

موبائل نمبر: 09422220640- 09423194153

قاری صدیق احمد باندوی آئی، ٹی، آئی

مقام پاٹودہ۔منجلے گاؤں، ضلع بیڑ M S

موبائل نمبر: 09011367007- 09423194253

ڈاکٹر ذاکر حسین آئی، ٹی، آئی انواء

ٹریڈ کا نام	لیاقت	مدت
الیکٹریشین	S S C پاس	۲/سال
فیٹر	S S C پاس	۲/سال

نوٹ: کھانے رہنے کا پورا انتظام

پتہ: ڈاکٹر ذاکر حسین آئی، ٹی، آئی۔مقام انواء، ضلع جالنہ، مہاراشٹر

فون نمبر: 02485- 242265 **موبائل نمبر:** 09422667669- 09423194153

مولانا حسین احمد مدنی ہائی اسکول کوساڑی

جامعہ اکل کوا کے ماتحت چلنے والی مولانا حسین احمد مدنی ہائی اسکول مقام کوساڑی، ضلع سورت میں

۱۱، ۱۲ر سائنس کلاس چلتی ہے، اس میں کمپیوٹر، فیزیکس کیمسٹری او ربایولوجی کی لیبوریٹری اور سائنس کے ہر ٹریڈ میں ماہر اساتذہ موجود ہیں ۔ایڈمیشن کے لیے دسویں پاس ہونا ضروری ہے۔

نوٹ: زیادہ جانکاری کے لیے

(۱) جگر خان، اے پٹھان: 09586786831

(۲) سعید بھائی بھولا: 09974831590

دنیوی تعلیم کے ساتھ دینی تربیت

جامعہ اکل کوا کی سرپرستی میں پالی ٹیکنک، یونانی میڈیکل کالج، آئی۔ٹی۔آئی۔، فارمیسی ڈی ایڈ، کالج، بی ایڈ، کالج، ابوالکلام آزاد اردو ہائی اسکول ۔ 8/910/11/12 چلائی جاتی ہے، ہر طالب علم دینی ماحول میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں، اور ان کی دینی تربیت بھی کی جاتی ہے۔

ان کو خارجی وقت میں ۱ر گھنٹہ ناظرہ قرآن کی تعلیم دی جاتی ہے، اور نماز کے متعلق بھی پابندی کرائی جاتی ہے۔

"اللغة العربيه لغير الناطقين بها" ورک شاپ

احاطہ جامعہ میں پہلی بار "دورہ معلمی اللغة العربية لغير الناطقين بها" کے عنوان پر ورکشاپ کا انعقاد ہوا، جس کے لیے ریاض کے مؤقر ادارہ "العربية بين يديك" نے وفد بھیجا تھا، جو الدکتور محمود المحمود اور شیخ احمد الشریمی پر مشتمل تھا جس میں جامعہ او رجامعہ کی شاخوں کے تقریباً ۳۳ر اساتذۂ کرام نے شرکت کی، جو واقعتاً ایک کامیاب ورکشاپ رہا جس سے متعلق مزید تفصیل آئندہ شاہراہ میں ملاحظہ فرمائیں گے۔ انشاءاللہ

اسفار رئیس جامعہ

جامعہ عمر بن خطاب کنج کھیڑہ میں

مولانا وستانوی کے ساتھ ۴۰ر مدارس کے نظماء کی اہم میٹنگ

جامعہ عمر بن خطاب کنج کھیڑہ میں مفکرِ قوم وملت مولانا غلام محمد وستانوی کی شاخہائے جامعہ اکل کوا کے نظمائے کرام کے ساتھ ایک اہم میٹنگ ہوئی جس میں علاقۂ مراٹھواڑہ وصوبہ مہاراشٹر کے دیگر اضلاع کے ۴۰ نظمائے مدارس نے شرکت کی مولانا محمد فاروق وستانوی نے بہترین انتظامات کئے تھے میٹنگ کا آغاز صبح ۹ر

بجے سے ہوا۔میٹنگ کے آغاز میں مولانا نے تمام نظماء سے مدارس کے نظام تعلیم وتربیت کے متعلق معلومات حاصل کی بعد ازاں آپ نے فرمایا کہ جامعہ اوراس سے ملحقہ مدارس کے قیام کا مقصد یہ ہیکہ قرآنی تعلیمات عام ہواور ہر کچے پکے مکان تک قرآن کی تعلیم پہونچ جائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتیں زندہ ہوں، ہم نے اکابر علماء کے منصوبہ کے تحت مدارس قائم کئے ہیں اسی نہج پر مدارس میں کام ہورہا ہے آپ نے مزید فرمایا کہ وقت پانی کی طرح گزر رہا ہے اس لئے نظماء اپنے کاموں میں تیزی پیدا کریں۔ ہروقت جائزہ لیتے رہیں کہ کتنا فیصد کام ہوا اور کتنا فیصد باقی ہے۔جامعہ نے امتحانات کا بڑا مضبوط اور مستحکم نظام بنایا ہے اس کے مطابق سال بھر جامعہ اکل کوا کی نگرانی میں امتحانات ہوتے ہیں امسال ششماہی امتحانات کے نتائج اور کیفیتیں شاخوں کو بھیج دی گئی ہیں ،لہٰذا نتائج امتحان کو سامنے رکھ کر سالانہ امتحان کی تیاری کریں جو تعلیمی کمزوریاں سامنے آئی ہیں ان کا ازالہ کریں تعلیم وتربیت کے نظام کو مضبوط بنایئے کہ یہی اصل مقصود ہے۔مولانا وستانوی نے مالی آمد وصرف سے متعلق فرمایا کہ ہر ناظم کے حسابات کے ریکارڈ میں شفافیت ہونا چاہیئے اس تعلق سے مرکز سے جو بھی ہدایتیں دی جاتی ہے اور حساب مانگا جاتا ہے اس پر فوراً عمل کریں اس باب میں غفلت وسستی نہ کریں مدرسہ ومطبخ میں صفائی پر خصوصی توجہ دیں۔آپ نے فرمایا کہ مجھے آپ حضرات پر پورا اعتماد ہے اور جامعہ اکل کوا کی شاخوں کا اتنے بڑے پیمانے پر جو نظام پھیلا اور پوری کامیابی کے ساتھ جاری وساری ہے اس کی ایک وجہ اللہ تعالیٰ کا فضل واحسان ہے اور دوسری وجہ اعتماد وبھروسہ ہے۔جامعہ کی پالیسی ہے کہ نظمائے مدارس مضبوط ہوں۔نظام تعلیم پر روشنی ڈالتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ شعبۂ دینیات ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے اس کو غیر اہم سمجھ کر نظر انداز نہ کریں اسی طرح شعبۂ حفظ میں حفظِ قرآن اور تجوید یہ دونوں کام استاذ کے ذمہ ہے اس کو الگ الگ نہ سمجھیں۔نیز شعبۂ عالمیت ہمارے مدارس کا بنیادی شعبہ ہے اس میں طلبہ کے اندر گہرائی وگیرائی پیدا کریں عربی زبان وادب پر توجہ دیں طلبہ کے اندر علمی رسوخ پیدا ہونا چاہئے۔اسی طرح شعبوں میں تعلیمی مسابقات کا سلسلہ بھی بدستور جاری رکھیں۔مدارس میں پڑھنے والے بچوں کو عصری تعلیم سے بھی آراستہ کریں اسکولوں میں

زیر تعلیم بچوں کی تعلیم کی بھی فکر کریں جامعہ کے اسکولوں اور کالجوں کا نیٹ ورک بھی بہت وسیع ہے لہٰذا نظماء اس طرف بھی توجہ دیں۔ آپ نے اپنی مخاطبت میں زور دیتے ہوئے فرمایا کہ یتیم وغریب بچوں کا ہر طرح سے پورا پورا خیال رکھیں، ان کے ساتھ ہمدردی کا معاملہ کریں۔ علاقہ کی غریب بچیوں کی شادیوں کی فکر کریں۔ جامعہ ماہِ رمضان میں یتیموں غریبوں اور بیواؤں کی امداد کرتا ہے لہٰذا اس کام کو مزید وسعت دینے کی ضرورت ہے اور تمام مستحقین تک امداد پہونچائی جائے۔ بجٹ کے سلسلہ میں آپ نے نظمائے مدارس کو ہدایت کرتے ہوئے فرمایا کہ نظماء اپنے اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کی فکر کریں۔ اگر آپ نے یہ کام کرلیا تو جامعہ مزید کئی مدارس قائم کرسکے گا۔ آخر میں آپ نے فرمایا کہ اللہ کی ذات پر بھروسہ اور اعتماد کریں بندوں پر بھروسہ نہ کریں کیونکہ مدارس کا نظام قدرتی اور منجانب اللہ ہے۔ اللہ سے تعلق مضبوط کریں اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلانے اور رونے والے بنیں تب ہی اللہ کی مدد آپ کے ساتھ ہوگی۔ اسی روز بعد نمازِ عصر مسجدِ عمری میں آپ نے جامعہ کنج کھیڑہ کے طلبہ کو نصیحت آمیز خطاب کیا۔ یہ اطلاع مولانا نور علی ملی ندوی نے دی۔

نکاح جتنا آسان ہوگا اتنا ہی معاشرہ پُرسکون و پُرامن ہوگا

۶/ ۴/ ۲۰۱۴ء بروز اتوار کنج کھیڑا میں کمیٹی کی طرف سے اجتماعی مجلسِ نکاح کا انعقاد ہوا، جس میں بحیثیت صدر رئیس جامعہ مدعو تھے۔ اس مجلس میں ۴۵/ نکاح ہوا، ایسی مجلسیں شادی بیاہ میں فضول خرچی سے بچنے کے لیے منعقد کی جاتی ہیں، اور یہ اس مقصد میں کافی حد تک کامیاب ہے۔

مسلم اور غیر مسلم علماء و حکمراں کی کثیر تعداد مجلس میں شریک رہی۔ رئیس جامعہ نے اس موقع پر فرمایا کہ نکاح جتنا آسان ہوگا اتنا ہی معاشرہ پُرامن و پُرسکون ہوگا، فضول خرچی نہیں ہوگی، فتنہ وفساد نہیں ہوگا۔ مسلمانوں کو نکاح میں کم خرچ کرنا چاہیے اور ان پیسوں کو اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت تجارت وکاروبار اور امدادِ غربا و مساکین پر صرف کرنا چاہیے۔ بیان کے بعد رئیس جامعہ نے خطبۂ نکاح دیا اور نکاح پڑھایا، اور آپ

ہی کی دعاء پر مجلس کا اختتام ہوا۔

جامعہ اصلاح البنات سہرسہ بہار

جامعہ اصلاح البنات سہرسہ بہار یہ ایک دینی و تعلیمی درسگاہ ہے، جو ایک غربت زدہ علاقہ میں واقع ہے۔

اس دینی درسگاہ میں ۶۷۵ کے قریب طالبات اپنی دینی پیاس بجھارہی ہیں، اس دینی درسگاہ میں تقسیم اسناد حفظ وقرأت اور مدرسہ کی عمارت کا سنگ بنیاد ۳/۸/ ۲۰۱۴ء کو عمل میں آیا، جس میں ۴۵۸/ فارغات اور ۵/ حافظہ کو اسناد دی گئی، اس اجلاس میں کثیر تعداد میں لوگ جمع تھے، مہمان خصوصی کی حیثیت سے حضرت مولانا وستانوی صاحب، مولانا محفوظ الرحمن عثمانی صاحب، حضرت مولانا صغیر احمد صاحب قاسمی، حضرت مولانا مجیب الرحمن رحمانی صاحب اور حافظ مجیب رحمانی صاحب مدعو رہے۔

اجلاس کے بعد اجتماعی نکاح کی مجلس منعقد ہوئی، جس میں ۱۰۰/ جوڑے رشتۂ ازدواج سے منسلک ہوئے، اخیر میں دعاء پر مجلس کا اختتام ہوا۔

(۱) جامعہ اصلاح البنات کی نگرانی میں ۱۰۷/ مکاتب بھی چلتے ہیں۔

(۲) حضرت وستانوی نے کچھ مکاتب کا خود دورہ کیا، اور تعلیم سے مطمئن ہوئے۔

(۳) بعد نماز عصر حضرت وستانوی صاحب اور دیگر علماء کرام کے ہاتھوں مدرسہ کی عمارت کا سنگ بنیاد ہوا۔

(۴) علاقہ کے مدارس اور مکاتب کے علماء کی مجلس ہوئی جس میں مولانا وستانوی دامت برکاتہم نے تعلیم سے متعلق اہم امور کی نشاندہی کی۔ حضرت رئیس الجامعہ کو اس ادارے کی طرف سے سپاس نامہ پیش کیا گیا۔

مولانا سعید صاحب وستانوی چھتیس گڑھ میں

فروری کے اواخر میں حضرت مولانا سعید صاحب وستانوی دامت برکاتہم نے چھتیس گڑھ کے کچھ علاقوں کا دورہ فرمایا، جامعہ اکل کوا کے زیر انتظام شاخوں کا جائزہ لیا، علماء وطلبہ دین کی فکر رکھنے والے احباب اور عوام سے ملاقاتیں کی، خطاب فرمایا اور مفید مشوروں سے نوازا، اس سفر میں احقر کو بھی حضرت کی رفاقت کا شرف حاصل رہا مختصر احوال سفر پیش خدمت ہیں۔

محمد رضوان اشاعتی/خادم مدرسہ قارہ ایم پی

اس صوبہ میں مسلمانوں کے دینی احوال انتہائی ناگفتہ بہ ہیں۔ ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے بالمقابل چھتیس گڑھ میں مسلمانوں کا تناسب کم ہے (حکومت کے جاری کردہ اعداد و شمار کے مطابق محض ۲ رفیصد)، ان میں بھی اکثر غربت اور جہالت کا شکار ہیں، نام کے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ارتداد کی کگار پر کھڑی ہے۔

اکثر گاؤں بلکہ نیم شہری علاقے بھی دین سے دور ہیں، اکثر مسلم آبادیوں میں مساجد موجود نہیں، نہ دینی رہنمائی کے لیے کوئی عالم اور نہ بچوں کی تعلیم کے لیے کوئی معلم، سیکڑوں کلومیٹر کا سفر کرلیں مسلم آبادیاں ہونے کے باوجود بھی کوئی مسجد نظر نہیں آتی جہاں مسافر نماز ادا کرلے، مساجد، مدارس، مکاتب اور علماء نہ ہونے کی وجہ سے دینی رہبری کا فقدان ہے، غیر مسلموں کے ساتھ کثرتِ مخالطت کی وجہ سے معاشرت و اعمال ہی نہیں دین کے نام پر انجام دیے جانے والے امور اور اعتقادات تک شرکیہ ہیں۔ بڑے بڑے شہری اور دیہی علاقے ایسے ہیں جہاں دینی تعلیم کا نظم نہیں۔ اسی جہالت اور بے دینی کی حالت میں، انہی شرکیہ اعمال و عقائد کے ساتھ نہ معلوم کتنے مسلمانوں نے زندگی گزاری اور اس دنیا سے رخصت ہوگئے اور کتنے ہی اس حالت میں زندگی گزار رہے ہیں اور زبان حال سے کسی رہبر و رہنما کے منتظر ہیں۔

اس موقعہ پر ہندوستان کی عظیم دینی و عصری تعلیم گاہ جامعہ اشاعت العلوم اکل کوا کے رئیس حضرت مولانا غلام محمد صاحب وستانوی ادام اللہ فیوضہم واطال اللہ عمرہم مع السلامۃ والعافیۃ نے اس طرف توجہ فرمائی، جن کو دنیا خادم القرآن، سلطان المدارس، معمار مساجد اور مختلف القاب سے جانتی ہے، جنہوں نے اپنی توجہ بطور خاص ان علاقوں کی طرف مرکوز کر رکھی ہے جو دین سے دور ہیں، جن کے زیر نگرانی ہندوستان کے ۱۵ ر صوبوں میں ۹۳ ر اداروں میں سوا لاکھ سے زائد طلبہ و طالبات زیور علم و ادب سے آراستہ ہو رہے ہیں، نیز جو طلبہ اقامتی درسگاہوں تک نہیں پہنچ پاتے ہیں ان کے لیے حضرت کی سرپرستی میں ملک بھر میں ۳۰۰۰ ر سے زائد

مکاتب جاری ہیں جن میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ سے زائد طلبہ قرآن، اردو اور دیگر دینی ضروریات کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں، اس کے علاوہ دینی ماحول میں عصری تعلیم دینے کے لیے حضرت کی نگرانی میں بیسیوں اسکول کالج چل رہے ہیں جن میں پرائمری، مڈل اور ہائی اسکول کے علاوہ آئی ٹی آئی، پالی ٹیکنک، ڈی ایڈ، بی ایڈ، یونانی میڈیکل کالج اور ایم بی ایس میڈیکل کالج بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ ہزاروں مساجد کی تعمیر، پانی کا انتظام، رمضان میں تقریباً ۱۰۰۰۰ ر بیوہ گان کی مختلف ضروری اشیاء سے امداد، اس کے علاوہ بھی تعلیمی، تعمیری اور رفاہی شعبہ جات میں آپ کی بے شمار خدمات ہیں جن کے تذکرے کے لیے ایک دفتر چاہیے (حضرت کا مختصر تعارف اور بعض اکابرین کے تاثرات کے لیے دیکھئے ''آفتاب ہند'' از محمد صہیب سبحانی قاسمی)

جامعہ اکل کوا کی نگرانی میں گذشتہ کئی سالوں سے مدھیہ پردیش کے چھتیس گڑھ سے لگے ہوئے علاقوں میں ادارے چل رہے تھے، مدھیہ پردیش میں اداروں کے قیام کے ساتھ ہی حضرت کی توجہ چھتیس گڑھ کی طرف تھی، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر کام کے لیے ایک وقت مقرر ہے، چنانچہ حضرت والا بھی ان علاقوں کی فکر فرماتے رہے، نیز ان علاقوں کے فکرمند احباب بھی حضرت سے اس علاقہ میں ادارہ قائم کرنے کا تقاضہ کرتے رہے، بالآخر وہ وقتِ موعود ومسعود بھی آپہنچا کہ حضرت والا نے دارالحکومت رائے پور سے تقریباً ۵۵ ر کلومیٹر دور بیمیترا ضلع کے ایک گاؤں ''رانکا'' میں جون ۲۰۱۱ء کو مدرسہ تعلیم القرآن کے نام سے چھتیس گڑھ میں جامعہ کی پہلی شاخ قائم فرمائی۔ دوسرا ادارہ حضرت نے کوربا ضلع کے ایک قصبہ کٹگھورا میں قائم فرمایا، جو رائے پور سے ۲۰۰ ر کلومیٹر اور صدر مقام کوربا سے ۳۰ ر کلومیٹر دور ہے۔ ان دونوں اداروں اور اس کے زیر انتظام مکاتب کی سرپرستی حضرت وستانوی دامت برکاتہم فرماتے ہیں۔

حضرت وستانوی کی ایما پر حضرت کے صاحب زادہ محترم جامعہ اکل کوا کے شعبۂ دینیات کے معین صدر حضرت مولانا محمد سعید صاحب وستانوی دامت برکاتہم نے چھتیس گڑھ کا دورہ فرمایا، ۲۶ ر فروری بروز بدھ دوپہر تقریباً ڈیڑھ بجے حضرت رائے پور تشریف لائے، رائے پور میں نماز وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد

حضرت رانکا تشریف لے گئے رات کو رانکا میں قیام فرمایا، طلبہ کا تعلیمی وتربیتی جائزہ لیا اور ادارے کے انتظامات کا معائنہ کیا۔

اس کے بعد حضرت نے ادارے اور اس کے ماتحت مکاتب کے اساتذہ اور مقامی علماء سے خصوصی خطاب فرمایا جس میں اولاً ایسے علاقہ اور حالات میں کام کرنے پر حضرت نے ان کی تحسین فرمائی، مبارک بادی دی، تعلیم میں مزید مضبوطی پیدا کرنے کی تاکید کی، اساتذہ سے خطاب کے بعد حضرت نے طلبہ میں خطاب فرمایا، حضرت نے ان کی ذہنی سطح اور عمر کے لحاظ سے سادہ اور دلنشین انداز میں قرآن کی تعلیم کی اہمیت بیان فرمائی، نیز محنت سے پڑھنے، مدرسہ میں گھر پر دعاؤں، نمازوں اور دیگر اسلامی اخلاق وآداب کا اہتمام کرنے کی تاکید کی، پھر حضرت ہی کی دعا پر مجلس کا اختتام ہوا۔

حضرت کی تشریف آوری کی اطلاع پر علاقہ کے بہت سے احباب شرف ملاقات وزیارت کے لیے حاضر ہوئے، طلبہ سے خطاب کے بعد حضرت نے ان سے ملاقات کی، احوال معلوم کیے اور ان کو ادارے کی طرف متوجہ فرمایا۔

اس ادارے کے ناظم "قاری نعمت اللہ صاحب اشاعتی" جو جامعہ اکل کوا کے فاضل ہیں، جوان العمر اور فکر مند عالم دین ہیں ان کی محنتوں سے مدرسہ نے بہت کم وقت میں بڑی ترقی کی ہے، مدرسہ کی ابتداء ہوئے ابھی صرف ڈھائی سال اور مدرسہ کو مستقل عمارت میں منتقل ہوئے صرف چھ مہینہ ہوئے ہیں؛ لیکن اس میں دینی تعلیم شعبۂ حفظ تک، عصری تعلیم دسویں جماعت تک ہے، ادارے میں اس وقت ۱۷۰ر طلبہ زیر تعلیم ہیں اور یہ ادارہ اس وقت طلبہ کی تعداد، شعبہ جات کی کثرت اور جگہ کی وسعت کے اعتبار سے چھتیس گڑھ کا سب سے بڑا ادارہ ہے، اس کے زیر انتظام ۶ر مکاتب قائم ہیں جن میں ۱۰۰ر سے زائد طلبہ قرآن، اردو اور اسلامی اخلاق وآداب کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں، نیز حضرت مولانا غلام محمد صاحب وستانوی کی سرپرستی ونگرانی، مدرسہ کے منتظمین کی فکر اور محنت سے امید ہے کہ ادارہ جلد ہی مزید ترقی کرے گا اور پورے علاقہ کے دینی فضاؤں سے

معمور و معطر ہونے کا ذریعہ بنے گا۔ (انشاء اللہ العزیز)

حضرت مولانا سعید صاحب کے رانکا قیام کے دوران ہی جامعہ کی دوسری شاخ مدرسہ عروج الاسلام کنگھورا کے احباب حاضر ہو گئے تھے، حضرت ظہر سے پہلے رانکا سے روانہ ہوئے اور بلاسپور میں ایک مقام پر ظہر کی نماز ادا کرتے ہوئے عصر کے وقت کنگھورا پہنچے۔

حضرت وستانوی دامت برکاتہم نے یہاں پر ستمبر ۲۰۱۱ء مدرسہ عروج الاسلام کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جو اس وقت کرایہ کی جگہ میں ہے اور زیادہ وسعت نہ ہونے کی وجہ سے ابھی صرف ۷۰ رطلبہ زیر تعلیم ہیں۔ تعلیم شعبۂ حفظ تک ہے، ادارہ کے ناظم مفتی حامد صاحب ہیں جو ماشاء اللہ جواں سال، فکرمند اور باصلاحیت عالم دین ہیں، اب الحمد للہ بستی کے قریب ایک وسیع قطعۂ اراضی میں مدرسہ کی شاندار عمارت تعمیر ہو چکی ہے جس میں جلد ادارہ منتقل ہو جائے گا، امید ہے کہ یہ ادارہ بھی علاقہ کا مرکزی ادارہ ہوگا، حضرت نے یہاں بھی تعلیمی اور انتظامی امور کا جائزہ لیا، طلبہ کو شفقت کے ساتھ نصیحت کی اور اساتذہ کو حوصلہ افزا کلمات کے ساتھ مفید ہدایات دیں۔

اللہ تعالیٰ رب العزت مولانا غلام محمد وستانوی، آپ کے صاحب زادۂ محترم حضرت مولانا سعید صاحب وستانوی اور تمام متعلقین کے علم، عمل اور عمر میں برکت عطا فرمائے، ان حضرات کے ان علاقوں میں ادارے قائم کرنے کو قبول فرمائے، ان حضرات کی تشریف آوری کو قبول فرمائے، ان علاقوں میں ذمہ داریاں سنبھالنے والے علمائے کرام اور کام کرنے والے احباب کو ہمت و استقلال عطا فرمائے، مخلص و معاونین و رجالِ کار اور رفقائے عمل مہیا فرمائے اور ان اصحاب باصفا کی توجہات اور آمد و رفت کی برکت سے اللہ رب العزت ہر دیہات و شہر میں قندیلِ دینِ محمدی روشن فرمائے اور ہر بستی کی فضا اللہ اکبر سے معمور فرمائے۔ (آمین)

اگلے دن جمعہ تھا، مدرسہ کے متعلقین اور علاقہ کے احباب نے حضرت سے اجازت لے کر نماز جمعہ سے پہلے مرکز میں حضرت کا خطاب طے کر دیا تھا اور شہر اور اطراف شہر میں اس کی دعوت بھی چلائی تھی، حضرت کی

آمد کی اطلاع پر علاقہ کا ایک بڑا مجمع نماز جمعہ سے بہت پہلے مسجد پہنچ چکا تھا، حضرت نے تقریباً ایک گھنٹہ تک مجمع سے خطاب فرمایا، اپنے خطاب میں حضرت نے بطور خاص اولاد کی تربیت، دینی تعلیم کی اہمیت اور تعلیم و تبلیغ کے جوڑ اور اس سے برآمد ہونے والے مفید نتائج بیان فرمائے۔

آپکا یہ خطاب نہایت ہی پر اثر ہوا جس میں آپنے نہایت ہی اچھوتے انداز میں، مدارس ،مکاتب، مساجد، تعلیم و تربیت، اصلاح و تبلیغ کی اہمیت اسکی ضرورت کو بیان فرمایا اور اسکے تئیں ہماری ذمہ داریوں کو جتلایا، جو نہایت ہی اہم ہے، انشاء اللہ اسکی اہمیت، ضرورت اور افادیت کے پیشِ نظر اگلے شمارے میں مستقل اسے شائع کیا جائیگا۔

جامعہ و فروعات جامعہ میں ختم بخاری شریف و تقسیم اسناد

صوبہ مہاراشٹر کی عظیم دینی، عصری و تربیتی دانش گاہ جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا کا ۲۶ رواں عظیم الشان سالانہ جلسۂ تقسیم اسناد و دستار فضیلت ۱۲ رشعبان ۱۴۳۵ھ مطابق ۱۱ رجون ۲۰۱۴ء بروز بدھ صبح ۷ ربجے، جامعہ کی عظیم الشان مسجد ''مسجد یمنی'' میں منعقد ہوگا۔

مہمانِ خصوصی

حضرت مولانا شاہ جمال الرحمن صاحب مفتاحی (صدر مجلس تحفظ ختم نبوت اندھرا پردیش)

حبیب الامت حضرت مولانا سید حبیب صاحب باندوی (جانشین حضرت باندوی، وناظم جامعہ عربیہ ہتھورا، باندہ)

اس عظیم الشان دینی اجلاس میں ۱۱ رطلبہ کو سند تکمیل افتاء، ۲۸۴ رفارغین کو سند فضیلت، ۴۳۶ رحفاظ کرام کو سند تکمیل حفظ اور ۹۲۶ رطلبہ کو تکمیل دینیات کی سند سے بزرگانِ دین اور عمائدین ملت کے ہاتھوں نوازا جائے گا۔ جمیع وابستگانِ جامعہ سے درخواست ہے کہ اس روح پرور نورانی اجلاس میں شرکت فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔

دارالعلوم بھاؤنگر میں ختم بخاری شریف و تقسیم اسناد

سوراشٹر کی مشہور دینی وتعلیمی درسگاہ اور جامعہ اکل کوا کی شاخ دارالعلوم بھاؤنگر کا ختم بخاری اور تقسیم اسناد کا شاندار سالانہ اجلاس تاریخ ۷/۶/۲۰۱۴ء بروز سنیچر بعد نماز عشاء رکھا گیا ہے، اس اجلاس میں مہمان خصوصی اور مقرر کی حیثیت سے خادم القرآن، معمار مساجد و رئیس الجامعہ حضرت مولانا غلام محمد صاحب وستانوی شرکت کریں گے، نائب رئیس الجامعہ حافظ اسحاق صاحب وستانوی کی سرپرستی میں ہونے والے اس اجلاس میں دارالعلوم بھاؤنگر کے شیخ الحدیث اور مہتمم حضرت مولانا حنیف صاحب وستانوی بخاری شریف کا آخری درس دیں گے اور اس کے بعد موقر اور بزرگ علماء کے ہاتھوں حافظ اور عالم ہونے والے طلبہ کے درمیان تقسیم اسناد ہوگی۔

اس مبارک اور عظیم الشان پروگرام میں تمام برادران مسلم کو دعوت دی جاتی ہے، اس سال ۴۵/طلبہ نے حفظ مکمل کیا، ۱۲/طلبہ نے عالمیت مکمل کیا، ۱۰۷/طلبہ نے ناظرہ مکمل کیا۔

جامعہ عمر بن خطابؓ کنج کھیڑا

کا چھٹا عظیم الشان جلسۂ ختم بخاری وتقسیم اسناد

جامعہ ہذا ایہ اورنگ آباد ضلع کا ایک مشہور اور فعال ادارہ ہے، جس کا شمار جامعہ کی عظیم شاخوں میں ہوتا ہے۔ الحمد للہ ۶/سال سے یہاں ختم بخاری شریف ہورہی ہے، اور فارغ ہونے والے طلبہ کے درمیان تقسیم اسناد فضیلت کے جلسہ کا انعقاد ہوتا ہے۔

اس مبارک جلسہ کی تاریخ امسال ۱۰/جون ۲۰۱۴ء بروز منگل رکھی گئی ہے، جس میں ۲۰/فارغین کو سند فضیلت ۳۰/حفاظ کو تکمیل حفظ، ۲۰/قراء کو سند قرأتِ حفص، ۱۲/قراء کو قرآتِ سبعہ، ۷۵/کو تکمیل دینیات اور ۲۰۰/بچیوں کو مومنہ کورس، ۱۰۰/طالبات کو ٹیلرنگ، ۲۵/طالبات کو کشیدہ کاری اور ۱۴/طلبہ کو بی۔یو۔ایم۔ ایس کی اسناد، صدر جلسہ وعمائدین جلسہ کے ہاتھوں سے عطا کیا جائے گا۔

اور اس کی صدارت رئیس جامعہ، خادم القرآن حضرت مولانا غلام محمد صاحب وستانوی فرمائیں گے۔

وفیات:

سوانح والدہ مرحومہ خیرالنساء بی حاجی محمد یعقوب صاحب بلوچ

ازقلم: الحاج محمد مختار ابن حاجی یعقوب صاحب بلوچ مکرانی

نانا جان کا نام عبدالرحیم تھا، ہم نے اپنے بڑوں سے سنا ہے کہ وہ بھی عالم تھے، فارسی، عربی اور دیگر کتب کا مطالعہ فرماتے تھے، یہاں تک بتاتے ہیں کہ کھیت میں جب جاتے تو اپنے ہاتھ میں کتاب لے جاتے تھے۔

نانی ماں کا نام نور بی تھا، بڑی عابدہ زاہدہ پابندِ صوم وصلوۃ اور تہجد گزار تھیں، والدہ خیرالنساء بھی بالکل اپنی والدہ نور بی کے نقشِ قدم پر تا حیات قائم رہیں، والدہ خیرالنساء صوم وصلوۃ کی پابند تھیں، اور ساتھ ہی ساتھ تہجد گزار بھی تھیں، البتہ چند سال سے رمضان المبارک کے علاوہ تہجد کی نماز نہیں پڑھ پاتی تھیں، کیونکہ اپنی ضعیف العمری کے باعث شدید بیمار رہا کرتی تھیں، خاص اور اہم بات یہ کہ رمضان المبارک میں نمازِ تراویح کھڑے ہو کر ادا کرتی تھیں۔

روزانہ ۱۰ یا ۱۲/ پارے قرآن مجید پڑھنا ان کا معمول تھا، البتہ اخیری ۳ یا ۴/ سال سے سورۂ رحمن، سورۂ واقعہ، سورۂ ملک، سورۂ روم، سورۂ حم سجدہ، سورۂ مزمل، سورۂ مدثر، سورۂ فتح وغیرہ سورتیں روزانہ پابندی سے پڑھنا ان کا معمول تھا۔ ہر پنجگانہ نماز کے بعد ۴۰ درود شریف پڑھا کرتی تھیں، روزانہ رات میں قرآن مجید کی کچھ سورتیں زبانی پڑھتے ہوئے سونا، ان کا معمول تھا یا پھر نیند کی حالت میں کچھ نعتیں گنگنایا کرتی تھیں، پیارے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نامی اگر کسی کتاب یا درود شریف میں دیکھتیں تو فوراً اسے چوم لیتیں اور سر آنکھوں پر رکھتیں۔

اپنی ۹/ سالہ زندگی میں ۲/ حج اور ایک عمرہ کیا، پہلا حج ۱۹۹۸ء میں اور دوسرا حج ۲۰۰۹ میں اور عمرہ ۲۰۱۱ میں ادا کیا پھر بھی ہمیشہ حج یا عمرہ میں جانے کی مشتاق رہتیں، کچھ رقم بھی جمع کر رکھی تھیں کہ ایک عمرہ آسانی

سے ہوجائے، حرمین شریفین میں نہایت باادب رہتیں، خصوصاً مدینہ منورہ میں چپل نہیں پہنتیں، پیادہ چلتیں یہاں تک کہ پاؤں مبارک میں آبلے آجاتے، دونوں حج اور عمرہ کے دوران عجیب باتیں دیکھیں۔ اللہ ورسول ﷺ قرآن مجید درود شریف کی بڑی عاشق تھیں۔

ہر اچھے کام سے خوش ہوتیں اور برے کام سے نفرت کرتی تھیں، تقویٰ طہارت کے اونچے مقام پر فائز تھیں، نماز اشراق، نماز چاشت بھی پڑھنا ان کا معمول تھا۔

اور اکثر کہا کرتی تھیں کہ پیر کا دن بڑا مبارک دن ہوتا ہے، کہ پیر کے دن ہمارے نبی ﷺ پیدا ہوئے تھے اور پیر کے دن اس دارِ فانی سے رخصت ہوئے، والدہ کو پیر ہی کی رات میں اچانک سانس کی تکلیف ہوئی اور سورہ یٰسین شریف کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور سینہ سے لگایا اور کہا اے اللہ اگر میرا آخری وقت آگیا ہے، تو مجھ کو کلمہ آسان کردے اور لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ پڑھتے ہوئے، اس دارِ فانی سے رخصت ہوئیں اور اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملیں۔ {انا للہ و انا الیہ راجعون}

تاریخ وفات: ۲۲/جمادی الاولیٰ ۱۴۳۵ھ مطابق ۲۴/مارچ ۲۰۱۴ء بروز پیر، مرحومہ والدہ خیر النساء واقعتاً خیر النساء تھیں۔

اللہ تعالیٰ والدہ مرحومہ کی بال بال مغفرت فرمائے، ان کے درجات کو بلند فرمائے، اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین۔ اور اللہ تعالیٰ میری تمام ماں بہنوں کو ایسی نیک خاتون کی حیاتِ مبارکہ کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق مرحمت فرمائے، آمین۔

☆......☆......☆